رسالہ
ماہنامہ
الرضا
مدرسہ ریاض العلوم چوکیہ گورینی، جونپور یوپی
صدیق رح نمبر
دسمبر ۹۷ء
پندرہ روپئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ریاض العلوم جون پور کا علمی، اصلاحی، دینی ترجمان

ماہنامہ

دسمبر ۱۹۹۷ء

ریاض الجنۃ

عارف باللہ حضرت اقدس قاری سید صدیق احمد باندوی

کی یاد میں

خصوصی اشاعت

جلد ۱۰

شمارہ ۱۲

زیر سرپرستی

حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب

دامت برکاتہم

مدیر مسئول

عبدالعظیم ندوی

بدل اشتراک

قیمت فی پرچہ	۶/۰۰ روپے
سالانہ فیس عمومی	۷۰/۰۰ روپے
سالانہ فیس خصوصی	۱۰۰/۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے	۳۰۰/۰۰ ہندوستانی روپے کے برابر
حضرات سرپرستان	۵۰۰/۰۰ روپے

دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپکا سالانہ زر تعاون ختم ہو چکا ہے۔ لہذا اول فرصت میں روانہ فرما کر ممنون ہوں۔

پرنٹر پبلشر

عبدالعظیم ندوی نے مونارک انڈسٹریز آفسیٹ پریس جونپور سے طبع کراکے دفتر "ریاض الجنۃ" مدرسہ ریاض العلوم چوکیہ، گورینی ضلع جونپور سے شائع کیا۔

ترسیل زر- خط وکتابت کا پتہ

مینیجر ماہنامہ "ریاض الجنۃ"

مدرسہ ریاض العلوم چوکیہ گورینی ضلع جونپور

یوپی (انڈیا)

کتابت: عبدالحی

ماہنامہ ریاض الجنۃ

نمبر شمار	عناوین	اصحاب قلم	صفحہ
۱	صدیقی نمبر سے متعلق خصوصی پیغام و دعا ۔	حضرت اقدس مولانا عبدالحلیم صاحب دامت برکاتہم	۴
۲	اداریہ ۔	عبدالعظیم ندوی	۵
۳	ایک ربانی عالم اور بزرگ شخصیت ۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب	۹
۴	مجاہدانہ زندگی ۔	پروفیسر محمد اجتباء ندوی صاحب	۱۵
۵	منزلوں کے سہارے گئے ۔	مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب کاکوری لکھنؤ	۲۰
۶	تعزیتی جلسہ ۔	مولانا محمد یوسف مدنی صاحب (برطانیہ)	۲۳
۷	باتیں انکی یاد آتی ہیں بہت ۔	مولانا محمد زکریا صاحب سنبھلی ندوۃ العلماء لکھنؤ	۲۵
۸	نمونۂ اسلاف ۔	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی شیخوپور، اعظم گڈھ	۴۹
۹	زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر ۔	مولانا عبدالوحید صاحب قاسمی پارہ کمال، جونپور	۵۴
۱۰	حضرت قاری صاحبؒ کی رحلت (منظوم)	مولانا محمد یونس صاحب صدیقی کرٹی، گجرات ۔	۶۱
۱۱	دنیائے تصوف کا شہنشاہ گیا ۔	مولانا محمد زبیر صاحب اعظمی ایولہ مہاراشٹر	۶۳
۱۲	ایک اور آفتاب غروب ہو گیا ۔	مولانا ناصر الدین صاحب مظاہر علوم وقف، سہارنپور	۶۷
۱۳	آہ ۔ حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہ ۔	قاری وسیم احمد صاحب جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ ۔	۷۸
۱۴	وہ جہانِ آذری میں رہے حق کا تازیانہ ۔	مولانا ولی اللہ ولی صاحب قاسمی اکل کوا مہاراشٹر	۸۱
۱۵	ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے	مولانا ذوالفقار احمد صاحب ترکیشور، گجرات	۸۲
۱۶	اک شمع رہ گئی تھی	مولانا عبدالواحد صاحب چندگڑھ، مہاراشٹر	۸۷
۱۷	مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے ۔	مولانا ابوسفیان قاسمی صاحب لونیہ ڈیہہ اعظم گڈھ	۸۹
۱۸	رباعیات	مولانا محمد زبیر صاحب اعظمی ایولہ، مہاراشٹر	۹۱
۱۹	میرے حضرتؒ کی شفقتیں	محمد اسلم صدیقی غیاث پور نوناری، جونپور	۹۲

نمبر شمار	عناوین	اصحابِ قلم	صفحہ
۲۰	قاری صاحبؒ کی وفات۔	مولوی فخر الاسلام مظاہری دہلی	۹۴
۲۱	باندہ ..... سے .... گورینی	مولانا محمد حمزہ صاحب گورکھپوری مدرس مدرسہ عربیہ ریاض العلوم گورینی	۹۹
۲۲	زمینِ ہند کا ذرہ چراغ آسماں نکلا۔	محمد معاویہ گورکھپوری متعلم " "	۱۱۹
۲۳	نبی کے عشق میں ڈوبا ہوا اللہ والا تھا۔	وحید الرحمٰن تاج سلطانپوری متعلم دار العلوم دیوبند	۱۲۷
۲۴	نالۂ غم	مولانا عبد الوحید صاحب قاسمی پارہ کمال جونپور	۱۲۸
۲۵	ایڈیٹر کے نام	(ادارہ)	۱۲۹
۲۶	کوائف مدرسہ ریاض العلوم	عبد العظیم ندوی	۱۳۲

نوٹ

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں!

(ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی کے لئے صرف جونپور کی عدالت مجاز ہوگی)

ایڈیٹر عبد العظیم ندوی

کوڈ ۰۵۴۵۳

فون آفس ۸۲۲۹

" رہائش ۶۳۵۸

مہمانوں کا ان کے حسبِ منصب حددرجہ اکرام کرتے انکی راحت وآرام کیلئے ہر ممکن کوشش کرتے ضیافت تو ایسی کہ دیکھنے والوں کو رشک اور ترس آنے لگتا اپنے اہل وعیال کی غرض سے پکے ہوئے کھانے کی ہنڈیا انڈیل لانا تو معمولی بات تھی مزید ضرورت پڑنے پر خود پیالہ لیکر نکل پڑتے اپنے اعزّہ واساتذہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور جو کچھ مل جاتا بغل میں دبا کرلے آتے اور مہمانوں کے سامنے لاکر رکھدیتے مہمانوں کی واپسی کیلئے سواری کا انتظام کرتے بس اڈے یا باندہ ریلوے اسٹیشن تک پہونچانے کی کوشش کرتے لطف یہ کہ مہمان جب تک اپنی منزل کیطرف روانہ نہ ہوجائے خواہ کتنا اصرار ہو آپ واپس نہ ہوتے۔

وسائل کی کمی اور تنگی کے اس دور میں طلباء واساتذہ کی درسگاہ واقامت گاہ کیلئے جسطرح بے چین ہوئے یا انکے خورد ونوش اور رہائش کیلئے غم اٹھایا اور دھوپ وبارش سے بچاؤ کی فکر کی اور جس قدر مجاھدے برداشت کئے آج اس کا تصور بھی دشوار ہے بس دل سے دعا نکلتی ہے اس جہد مسلسل کے صلہ میں اللہ جل شانہٗ اعلیٰ علیین میں بلند مقام عطا فرمائے۔

بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے قاری صاحبؒ کے اس عسرت بھرے دور کو قریب سے دیکھکر دامے درمے قدمے سخنے معاونت کی۔ قابلِ صد مبارکباد ہیں وہ اساتذہ وملازمین جو بدون رائج اجرت کے محض رضائے الٰہی کیلئے قاری صاحبؒ کا ہاتھ بٹایا ان کے اضطراب اور غم کو ہلکا کرنے میں شریک کار رہے انکی فکر کو اوڑھنے کی ہر ممکن سعی کی ان حضرات کو اللہ تعالیٰ دونوں جہان کی سرخروئی نصیب فرمائے اور خاندانی افراد، اولاد، احفاد تو حددرجہ قابلِ رشک ہیں جنکی پیشانی پر کبھی بل نہیں آیا نہ زبان پر حرف شکایت، باپ کی مالی کمزوری، قناعت، سادگی اور ہر تنگی کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔

جب قاری صاحبؒ کی تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ۔ قبولیتِ دعاء، تواضع وانکساری، تقویٰ واخلاص، ایثار وقربانی، رحم وشفقت، ہمدردی وغمگساری کا ڈنکا بجا تو ملک کے گوشے گوشے سے لوگ کھنچ کر پہونچنے لگے اگرہتھورا کی سرزمین پر طلباء، علماء، مشائخ اور اکابر امت جلوہ افروز ہوئے تو ایم پی، ایم ایل اے وزراء اور حکومتی سطح کے اعلیٰ عہدیداران بھی گردن جھکائے حاضر ہوئے۔ اسی کے ساتھ نامور امراء، رؤسا، بھی پہونچکر حلقہ بگوش ہوئے۔ نیز پولیس کو مطلوب اور مشہور رہزن وقاتل بھی آکر قدموں میں گر گر گذشتہ زندگی سے تائب ہوئے۔ اور پریشان حال غرباء مساکین، لاعلاج مریضوں اور مسلم وغیر مسلم دعا وتعویذ کے طالبین کی لائن لگ گئی —— لیکن واہ رے قاری صاحبؒ —— ہر ایک کی دلداری کی کوئی محروم ہوا نہ مایوس۔ پہونچا تھا تو (بدحالی وپریشانی کیوجہ سے) آنکھوں سے آنسو چھلک رہا تھا۔ زیارت وملاقات کے بعد جب تسلی کے کلمات اور دعا

لیکر لوٹا تو خوشی کے مارے دل بھی مچل رہا تھا۔

واحسرتاہ — امت کی فکر میں غمگین و بے چین رہنے والا۔ ان کے دکھ درد میں کام آنیوالا اسوۂ نبوی کا حامل۔ دین متین کا پاسبان (۲۸؍ اگست ۹۶ءکو) اچانک ہم سے جدا ہوگیا۔ اللہ پوری امت کی طرف سے اپنی شایانِ شان خُلدِ بریں میں بہتر ٹھکانہ مرحمت فرمائے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعہ۔

شمارہ ھذا سے متعلق

قاری صاحب کے وصال سے چند روز پہلے ستمبر اکتوبر کا شمارہ طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکا تھا اور نومبر کی تیاری ہو رہی تھی لہٰذا نومبر کا اداریہ آپ کی وفات سے متعلق تحریر کیا گیا پھر انہی دنوں مختلف علماء واہلِ قلم کے لائقِ قدر مضامین دستی و ڈاک سے موصول ہونے لگے جنکا سلسلہ ہنوز جاری ہے، متعدد مضامین کی وجہ سے احباب بالخصوص کارکنانِ ادارہ نے طے کیا کہ دسمبر کا شمارہ قاری صاحب ہی سے متعلق خصوصی شمارہ کر دیا جائے اب وسائل کی کمی کیوجہ سے کتابت وطباعت میں قدرے تاخیر ہوگئی ہے جس کیلئے ادارہ معذرت خواہ ہے پھر بھی انشاء اللہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اس شمارہ میں آپ اپنے اکابر، علماء و دیگر اہلِ قلم کے مضامین پڑھیں گے اور ہر مضمون جُداگانہ نوعیت و اہمیت کا باعث ہے — اسی کے ساتھ ہمیں اعتراف ہے کہ خصوصی شمارہ کیلئے مزید مواد اکٹھا کر کے اور بہتر بنانا چاہیے تھا لیکن قارئین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خصوصی شمارہ جات کی اشاعت میں "ریاض الجنۃ" کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ اب ۱۳۶؍ صفحات پر مشتمل پیش خدمت ہے جس کی عمومی قیمت پندرہ ۱۵ روپیہ رکھی گئی ہے مستقل خریداروں کو سابقہ ممبری فیس کے تحت دیا جائے گا جبکہ پانچ کاپی سے زائد خریدنے والے کو ۲۵ فیصد رعایت دیجائے گی (ڈاک خرچ بذمہ خریدار)۔

اور آئندہ سے متعلق

معزز قارئین! — الحمدللہ "ریاض الجنۃ" کے شمارے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتے رہے

اہل علم اور اصحاب ذوق اس چشمۂ فیض سے کما حقہ، مستفید ہوتے رہے قارئین رسالہ اسکی افادیت کے معترف ہیں اور اس کا اظہار بھی برابر کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ سال ۹۷ء اختتام کو پہونچ گیا ہے اور ایک خاصی بڑی تعداد ایسے حضرات کی ہے جنھوں نے ابھی تک اپنا زرِ تعاون ارسال کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی جبکہ رسالہ ماہ بماہ انکی خدمت میں روانہ کیا جاتا رہا ہے۔ نیز برائے یاد دہانی انھیں بارہا مطلع بھی کیا گیا، ان تمام تر کوششوں کے باوجود خود کو بری الذمہ کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

اُن کرم فرماؤں سے التماس ہے جو رسالہ کی خریداری موقوف کرنا چاہتے ہوں از راہ کرم فی الفور اپنے خیال اور فیصلہ سے آگاہ فرمادیں تاکہ رسالہ کی ترسیل روک دی جائے، بصورتِ دیگر ادارہ کو کافی خسارہ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ آپ اپنے طور پر نیت کر لیتے ہیں اور خود کو بری الذمہ کر لیتے ہیں خدارا ادارہ کو بھی آگاہ فرمادیں جو آپکی شرعی ذمہ داری ہوتی ہے اسکا تعلق عقد معاملہ سے ہے اور یہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

انھیں حالات سے مجبور ہو کر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو خریدار آئندہ ۹۸ء کیلئے یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں وہ ضرور بالضرور اپنا زر تعاون فی الفور روانہ کر دیں یا خریداری جاری رکھنے اور بند کرنے کے بارے میں مطلع کر دیں، ورنہ رسالہ بھیجنے سے ہم معذور ہوں گے۔ امید ہے کہ ہماری یہ صدا، بصحرا ثابت نہیں ہوگی بلکہ آپکا تعاون ادارہ کے ساتھ مکمل اور مسلسل رہے گا۔ انشاء اللہ۔

والسلام

(صـ ۸ کا بقیہ)

سے کچھ نہ لینے اور وسائل نہ ہونے کیوجہ سے گھر میں کئی کئی دن تک چولہا نہ جلا۔

۲۷ ربیع الثانی بروز چہارشنبہ ارکان شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ ہوئی جس میں متفقہ طور پر حضرت مولانا حبیب احمد صاحب مدظلہٗ کو ناظم منتخب کیا گیا آپ نے شدت سے انکار کیا اور روز اول ہی یہ درس دیا کہ نظامت انکار کی چیز ہے۔ مگر ارکان شوریٰ نے کہا کہ جس طرح ہمارے تجویز کردہ قانون مدرسہ کیلئے ہیں اسی طرح آپ کیلئے بھی اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بعد نماز ظہر ہزاروں طلباء اور مہمانوں کی موجودگی میں حضرت مولانا رابع صاحب مدظلہٗ، رکن شوریٰ اسکے بعد مفتی عبدالرزاق صاحب قدرے تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے ناظم کا اعلان کیا ایک مرتبہ پھر چیخ و پکار سے مسجد گونج اٹھی اور آنکھیں نمناک ہوگئیں تصور میں حضرت کے اخلاق حمیدہ عادت شریفہ گردش کرنے لگیں، دعا ہے کہ اللہ پاک ان لوگوں کو، اور ہم لوگوں کو حضرت کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی رح

ایک ربانی عالم اور بزرگ شخصیت تھے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی رح کے سانحہ ارتحال پر مسجد دار العلوم میں ۳۰ اگست ۱۹۹۷ء کو ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ نے قاری صاحب رح کی روحانی شخصیت اور ان کی علمی و دینی خدمات پر اہم تقریر فرمائی، افادہ عام کی غرض سے ہم اس کو ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ ــــــ (ادارہ)

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

" وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ "

میرے رفقائے کرام اور طلبائے عزیز! میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی، یہاں مسجد کیطرف آتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا القا ہوا اور اس سے زیادہ موزوں اور اس سے زیادہ مفید اور قابلِ غور تمہید نہیں ہو سکتی اور کوئی ایسا جامع جملہ نہیں کہا جا سکتا،

قرآن مجید کی یہ آیت بھی ایک مستقل معجزہ ہے بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ " ولکن کونوا ربانیین "، لیکن تم اللہ والے بنو، پھر اس کیلئے بھی اللہ تعالیٰ نے ربانیین کا لفظ استعمال کیا ہے اسمیں تربیت بھی داخل ہے، یعنی وہ عالم جو ایک طرف رب سے تعلق رکھتا ہو، رب سے اس کا تعلق صحیح ہو، اخلاص اسکو حاصل ہو، اور دوسری طرف اسکو ایمان و احتساب کا درجہ حاصل ہو، یعنی وہ دعوت و تربیت اور اصلاح کیطرف بھی متوجہ ہو۔

میں عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں جانتا کہ کوئی لفظ اتنا جامع و معنیٰ خیز اور ایسا توجہ طلب اور نظر افروز ہو سکتا ہے، علمائے امت اور علمائے اسلام کو اللہ تعالیٰ ربانیین کے لفظ سے یاد کرتا ہے، " اللہ والے بنو " لیکن اللہ تعالیٰ کی صفت میں " رب " کا لفظ انتخاب فرمایا گیا ہے کہ ایسے علماء بنو جن کے اندر

تربیت کا مادہ ہو، تربیت کی صلاحیت بھی ہو، انھیں کو علمائے ربانیین کہتے ہیں، اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ،

" بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون"۔

کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دو، اس کیساتھ "تدرسون" کا لفظ بھی لگایا گیا جو ہمارے اور آپ سب کے لئے قابل غور ہے کہ عالم ربانی، عالم کامل اور باکمال بن جانے کے بعد بھی ضرورت ہے کہ مطالعہ جاری رہے، استفادہ اور علمی سفر جاری رہے، علمی ترقی جاری رہے، یہ آیت تو قیامت تک پڑھی جانے والی آیت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت تک اس امت میں علماء کو پیدا کرتا رہے گا اور پھر ایسے روحانی تربیت کرنے والے، اور پھر دینی تعلیم دینے والے اور پھر دین کے لئے کوشش و مجاہدہ کرنے والے پیدا کرنے کی دعوت دی جاتی رہے گی تو اس لئے ایک ایک لفظ معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور وہ قرآنی بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔

آج ہم جس ہستی کو یاد کرنے کیلئے اور اپنے عقیدت و محبت کا خراج پیش کرنے کیلئے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت اور رفع درجات کی دعا کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں، اور آئندہ کے لئے بھی یہ یاد تازہ کرنے کے لئے، جب کبھی مجلس ہو، محفل ہو، اس پر اکتفا نہیں، اس کے باہر بھی آپ یاد کریں، اس کے لئے یہ آیت مجھے القاء ہوئی، میرے ذہن میں ڈالی گئی کہ ان کی بہترین تعریف ہو سکتی اور تعریف ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لئے دوا بھی ہے، یہ تقریر ندوۃ العلماء میں کیجا رہی ہے مسجد میں کیجا رہی ہے، طلبہ و اساتذہ کے سامنے کیجا رہی ہے، طالبین علوم دینیہ کے سامنے کیجا رہی ہے جہاں آئندہ کے لئے وہ امت کے نمائندہ و ترجمان اور کتاب و سنت کے شارح اور دین حق کیطرف بلانے والے پیدا کئے جائیں گے اور ان علماء کو تیار کرنے کے لئے یہاں مدارس قائم ہیں، ان کے لئے یہ آیت ایک پوری موعظت، پوری دعوت اور ایک پوری کتاب ہے۔

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ جس زمانے میں مظاہر علوم میں پڑھتے تھے پچاس ساٹھ برس پہلے یا اس سے زائد مدت ہوگی، میں جب حضرت شیخ الحدیث کی زیارت کیلئے جایا کرتا تھا یا رائے پور جایا کرتا تھا تو سہارنپور ٹھہرتا ہوا جاتا یا واپسی میں ٹھہرتا تو مظاہر علوم بھی جاتا تھا، اس وقت ہمارے تعلق والے تین عزیز تھے ایک ہمارے عزیز بھانجہ مولوی محمد ثانی حسنی مرحوم، اور ایک ہمارے یہاں دار العلوم کے بڑے کارکن بننے والے مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم بستوی اور ایک مولانا قاری سید صدیق صاحب یہ تینوں اکثر ساتھ ہی ملتے تھے، وضو کر رہے ہیں تو دیکھا تینوں ساتھ وضو کر رہے ہیں، نماز میں کھڑے ہوتے تو تینوں ساتھ ہی میں کھڑے ہوتے۔ میں مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں التزاماً جایا کرتا تھا، ان سے ان تینوں کا روحانی تعلق تھا، انھیں سے وہ مجاز تھے، تو مظاہر علوم میں ان تینوں سے ساتھ ساتھ ملاقات ہوتی تھی، ان سے اس وقت سے تعارف ہے، اس کے بعد فارغ ہو کر نکلے تو پھر انھوں نے پہلے تو فتحپور

کے مدرسہ میں جو مولانا ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کیا ہوا تھا، مولوی عبدالرحیم فتحپوری اس کے اسوقت مہتمم تھے وہاں کچھ عرصہ تک پڑھاتے رہے۔ فتح پور سے ہمارا قرابتی تعلق بھی ہے، جوار کا بھی تعلق ہے، وہاں جاتے تھے تو اس مدرسہ میں حاضر ہوتے تھے وہاں مولانا قاری سید صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوتی تھی، وہ بہت خصوصیت کے ساتھ ملتے تھے، پھر اسکے بعد بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے اپنے وطن ہی کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا، اور مدرسہ قائم کیا، صرف قائم ہی نہیں کیا بلکہ مدرسہ کے ساتھ انھوں نے عام مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت اور اسکی دعوت کو اپنا فرض سمجھا، اور یہی مدارس کی حقیقت اور ان کا اصل فریضہ ہے اور یہی مدارس کے نظام میں شامل ہے کہ مدارس جزیرہ نہیں بن سکتے، جو مدارس جزیرہ بن جاتے ہیں وہ ڈوب جاتے ہیں، مدارس کے لئے ضروری ہے کہ وہ باہر سے اپنا تعلق رکھیں اور یہ سمجھیں کہ باہر کی فضا اور باہر کا ماحول اگر ٹھیک نہ ہوا تو ان مدارس کا بھی قائم رہنا مشکل ہوگا، ایک جزیرہ بن کے نہیں رہ سکتے، کوئی بھی چیز دنیا میں جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتی، جب تک کہ وہ اپنے اثرات کو پھیلائے نہیں، اور ایسا ماحول نہ پیدا کریں، جو اسکے لئے مناسب ہو، اس کے لئے مفید ہو۔

حضرت مولانا کی بصیرت و شرح صدر، اور توفیقِ الٰہی کی بات تھی کہ انھوں نے دونوں کام ایک ساتھ شروع کئے ایک طرف مدرسہ اور دوسری طرف آس پاس کی بستیوں سے، اس کے شہروں سے رابطہ قائم کرنا، اور بار بار جانا اور دعوت کا کام کرنا، اور دینی جلسوں میں شریک ہونا، اور ان کو صحیح عقیدہ اور اصلاح نفس کا پیغام دینا، اس سے انکی مصروفیات اتنی بڑھی، ان کے مجاہدے اتنے بڑھے کہ بعض مرتبہ مجھے بھی اس تعلق کی بنا پر جو انکے ذات سے تھا اور ان کا ہمارے خاندان والوں سے تھا، اور حضرت سید احمد شہیدؒ سے تو ان کو بڑا تعلق تھا۔ تو اس بنا پر بھی، اور پھر انکی افادیت اور انکی زندگی کی قیمت کی بنا پر بھی میں نے بعض مرتبہ یہ پیغام بھیجا کہ آپ اتنا دور دراز کا سفر کرتے ہیں، اور جفاکشی کرتے ہیں، اور احتیاط نہیں کرتے، تو یہ مناسب نہیں، ان کا یہ حال تھا کہ بالکل اس بارے میں وہ مجذوب الفکر تھے، مجذوب الحال تھے، اور وہ اسکی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ کیا تعب ہوگا، اور ان کی صحت پر کیا اثر پڑے گا، پھر ان کی صحت پر اثر پڑا، حقیقت میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ علمائے ربانیین میں تھے۔ "ولکن کونوا ربانیین"، کہ اللہ تعالےٰ نے ان سے دین کی تعلیم کا بھی کام لیا اور دین کی اشاعت کا بھی اور اصلاح کا بھی اور شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے کا، رسوم و بدعات جو مسلمانوں کی زندگیوں میں شامل ہوگئی ہیں، اس کے خلاف تقریر کرنا لوگوں کو متوجہ کرنا، بڑے انہماک اور تندہی بلکہ ایک طرح سے جو مدہوشی ہوتی ہے اپنی صحت کیطرف سے آنکھیں بند کرکے، ان سب سے بے پرواہ ہوکر عبادت سمجھ کر یہ کام کرتے تھے، اور جو چیز ان کی امتیازی ہے وہ ......

ایمان واحتساب ہے اور یہی ربانیین کے لئے ضروری ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اللہ کی رضا کے لئے ہی کیا جائے، اللہ کی قدرت واستعانت پر یقین کرتے ہوئے بھی، اور پھر اجر وثواب کی لالچ سے کیا جائے، یہ بات اسوقت ادنیٰ تنقیص کے بغیر، تنقیص تو بڑی چیز ہے، ادنیٰ تنقید کے بغیر میں کہتا ہوں کہ کوئی مقابلہ نہیں ہے، علماء میں، میں مقابلہ نہیں کرتا، سب اپنی جگہ قابلِ احترام ہیں — الحمد للہ بعض ہستیاں یہاں بھی موجود ہیں اور جو اللہ کے یہاں چلے گئے ان کے درجے بلند کرے لیکن بہر حال اپنے مطالعہ وواقفیت کا مسئلہ ہے کہ ہم نے اپنے مطالعہ و واقفیت کے حدود میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جس درجہ کا مخلص جس درجہ کا فکرمند، جس درجہ کا سرفروش کہنا چاہئے، اور اپنی زندگی کو نیز صحت کو خطرہ میں ڈالنے والا بہت کم دیکھا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی وفات پر اس مقبولیت عامہ کا اظہار ہوا، جو عرصہ سے کسی ہستی کے بارے میں ہمارے علم میں نہیں آیا، اللہ کے یہاں کس کا کیا درجہ ہے اللہ جانتا ہے اور اسی کا اعتبار ہے، اور ایسا بھی بہت ہوا ہے کہ اللہ کے بعض بندے دنیا سے ایسے گئے کہ نماز جنازہ کی نوبت نہیں آئی، میں تین آدمیوں کا نام لیتا ہوں، ایک سیرت رحمۃ للعالمین کے مصنف حضرت مولانا قاضی سلیمان منصورپوریؒ ان کی میں نے زیارت بھی کی ہے، ان کا انتقال جہاز پر ہوا، اور انکی لاش سمندر کے سپرد کر دی گئی، اور ایک حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ فتحپوری، ان کا انتقال بھی جہاز پر ہوا، اور ان کی لاش بھی سمندر کے سپرد کر دی گئی، مجھے خوب یاد ہے کہ وہ بمبئی میں تھے، کرلا محلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، تو کسی جگہ شام کو چائے کی دعوت تھی اور ہم حجاز سے واپس آئے تھے، مولانا منظور صاحبؒ بھی موجود تھے، اور شیخ ابو الفتاح ابو غدہؒ بھی تشریف رکھتے تھے، وہاں ہمیں قریب بلایا یہانتک کہ آخری نشست گاہ پر بٹھالیا اور کان کے پاس منہ لاکر رازداری سے کہا کہ دعا کرو اللہ وہاں پہونچادے، ہمارے ذہن میں آیا کہ ان سے کہیں کہ صبح جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں اب اس میں کیا تردد کی بات ہے کہ پہونچ جائیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے یہ بات وارد ہوئی تھی، انھیں شبہ تھا، چنانچہ یہی ہوا کہ ان کا جہاز پر انتقال ہوا، اور وہاں سے ان کے تعلق والوں نے سعودیہ سے ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ قائم کیا کہ ہم ان کی لاش کو یہاں لانا چاہتے ہیں، انھوں نے اجازت دی کہ تدفین ہو سکتی ہے لیکن قبل اس کے کہ نیچے والوں تک یہ پیغام پہونچے، اوپر والوں نے سنا، اور نیچے والے لاش لے گئے اور سمندر کے سپرد کر دی، اور کیا ہو سکتا ہے سمندر میں؟ انھوں نے دیر کر دی وہاں تک پیغام پہونچانے میں تو انھوں نے سمندر کے حوالہ کر دیا، اور ایک تیسرے بزرگ مفتی عنایت احمد کاکورویؒ تھے، ان کی درسی کتابیں نصاب میں داخل ہیں، ان کا بھی انتقال سمندر میں ہوا، اور وہ سمندر کے سپرد کر دیئے گئے، ایسا بھی ہوا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو علم ہے کہ کس کا کیا درجہ ہے،

اس سے کوئی تنقیص نہیں ہوتی ہے، اصل چیز تو وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے ساتھ جو معاملہ ہو، اللہ تعالیٰ جس طرح جانتا ہے اس کو علم ہے، اور جو قدر ہے انکے یہاں، وہ سارے اژدحام، وہ سارے جلوس، جلسے اور ماتم، اور پھر یہاں تک ان کی تصنیف و تالیف، ان سب سے بالاتر چیز یہ ہے کہ اللہ راضی ہو، انتقال کہیں بھی بھی ہو" وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِأَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا" یہ سب کچھ ہے لیکن یہ ایک ظاہری علامت ہے کہ ان کے انتقال پر جس طریقہ سے یہاں مسلمانوں نے ان کے وطن کے صرف نہیں بلکہ دور دور کے مسلمانوں نے اس تعلق کا اظہار کیا، یہ بہت کم دیکھنے میں آیا، ہزاروں ہزار کا مجمع تھا، ہمارے یہاں سے الحمدللہ ہمارے عزیز مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مہتمم دارالعلوم اور ان کے بھائی مولانا سید واضح رشید ندوی، یہ لوگ بھی گئے، اور یہاں آکر بیان کیا کہ کئی کیلو میٹر تک سواریاں کھڑی تھیں، بسیں بھی تھیں اور موٹریں تھیں، اور ان کو پیدل چلنا پڑا، اور پھر اسکے بعد وہاں ہزاروں ہزار کا مجمع تھا اور آج کے "قومی آواز" میں بھی جگہ جگہ ان کے انتقال پر جس تاثر کا اظہار کیا گیا، مسلمانوں نے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ چیزیں آج کے اخبار میں شائع ہوئی ہیں اور شائع ہوتی رہیں گی۔

میرے عزیزو! آپ کے لئے صرف اتنی بات نہیں کہ یہ فریضہ ادا کیا جا رہا ہے، ایک ضابطہ کی بات ہے کہ تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے، ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ان کی زندگی پر غور کریں کہ ان کو یہ مقبولیت کیوں حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کو یہ مقام کیوں ملا، اور ایک عالم کو، ایک دینی مدرسہ کے فارغ کو، کس کو اپنا مقتدیٰ بنانا چاہئے، اور کیا اس کو طرز اختیار کرنا چاہئے اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے، اور کس جامعیت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے کہ ایک طرف تو علم راسخ ہو، علوم نبویہ پر پورے طور پر قدرت ہو، استحکام ہو، اتقان ہو، اتقان علمی ہو، پھر اس کے ساتھ ساتھ عمل ہو، عالم کے شایان شان جو عمل ہے، جو ذوق عبادت ہے جو ذوقِ طاعت ہے اور جو ایمان و احتساب کا مادہ ہے، وہ پیدا ہونا چاہئے کہ آج ہم اللہ کی رضا کے لئے پڑھ رہے ہیں، اور ہم یہاں سے فارغ ہونیکے بعد دین کا کام کریں گے، یہ نہیں کہ پڑھ کر نکلے، خلیج چلو، دوبئی چلو، شارقہ چلو، سعودی عرب چلو، نام تو حج وعمرہ کا لیکن مقصود یہ ہو کہ کہیں جگہ مل جائے اور مل جاتی ہے، کوئی صاحب کسی سفری ایجنٹ کے یہاں کام کر رہے ہیں، کوئی صاحب دواؤں والی دوکان میں کام کر رہے ہیں، اور کچھ نہیں تو مسجد کے مؤذن بن گئے، خطیب بن گئے، یہ اس کی قیمت نہیں، یہ "کونوا ربانیین" کے انداز کی بات نہیں، یہ اس کے خلاف ہے، "کونوا ربانیین" یہ ہے کہ آپ نیت کریں کہ آپ یہاں سے نکلنے کے بعد قاری صدیق صاحبؒ کے نقشِ قدم پر چلیں گے، اور علمائے ربانی کے جوان سے پہلے کے ہیں یا ان کے زمانہ کے تھے یا اب بھی ہیں، خدا

کے فضل سے دنیا خالی نہیں ہے، ہندوستان بھی خالی نہیں ہے، ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے نقشِ قدم پر چلیں گے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبد الباریؒ، اور ندوہ کے دوسرے علمائے ربانیین ہیں جنھوں نے وقت کے مسائل اور خطرات کا اندازہ کیا، دین میں جو تبدیلی ہو رہی تھی، اور جو تبدیلی لوگ کرتے تھے، اور اس کے لئے ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، وہاں تقریر بھی کی گئی، علم کلام پر کتابیں بھی لکھی گئیں، ان میں ہر چیز کو موجودہ مغربی علم و فکر کے مطابق، اور اس کو سائنس کی روشنی میں قابلِ عمل ثابت کرنے کے لئے قرآن مجید۔ اور انبیاء کے معجزات تک کو بھی نشانہ بنایا گیا کہ گویا وہ معجزہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک طبعی امر تھا۔

الحمد للہ ہمارے ندوی فضلاء نے وقت کے فتنوں کا نوٹس لیا اور اس کو محسوس کیا، اور پھر اس کے بعد انھوں نے دین کو اپنی شکل پر رہنے کے لئے کوشش کی کہ دین میں کوئی تحریف نہ ہو، اور انحراف نہ ہو، یاد رکھئے کہ انحراف اور تحریف دو چیزیں ہیں، ایک انحراف ہے اس کا تعلق عوام سے ہے اور تحریف کا تعلق ذی علم سے ہے، اور انحراف و تحریف دونوں سے حفاظت کا کام ہر ملک میں تقریباً انجام پایا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو اس کی توفیق دی، اور یہ کام مغرب اقصیٰ میں بھی ہوا، مراکش، الجزائر میں بھی ہوا، یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو توفیق دی، انھوں نے دین صحیح کی دعوت دی، اور قرآن مجید کی آیات اور معجزات قرآنی اور محکمات کی وضاحت کی، اور جو حدیث کے ترتیبی پہلو ہیں، ان سب کو ثابت کیا۔

مولانا عبد الباری صاحبؒ نے اپنی کتاب میں.....

...... یہ بات ظاہر کی ہے... انھوں نے کہا ہے کہ مذہب اور سائنس میں کہیں ٹکر ہو ہی نہیں سکتی، جس طرح موٹر اور کشتی کی ٹکر نہیں ہو سکتی، ریلوے اور جہاز کی ٹکر نہیں ہو سکتی، کشتی چلتی ہے پانی میں، موٹر اور ریل چلتی ہے خشکی میں، یہ کہاں سے ٹکرائے گی، ان کے ٹکرانے کا امکان ہی نہیں ہے، یہ جو خیال پیدا کیا گیا کہ علم و دین میں ٹکراؤ ہے، جمع نہیں ہونے پاتے، علم تصدیق نہیں کرتا ان سب چیزوں کے ہونے کا، یہ سب غلط ہے اس لئے کہ وہ تو ایک قادرِ مطلق کا عمل ہے، اس کا حکم ہے "انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون" اس مسئلہ پر میں نے انکی کتاب پڑھی، یہ کتاب یقین افروز ہے، الحمد للہ ہمارے عزیز مولوی واضح نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور ہم نے مقدمہ لکھا، اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے معجزات کے بارے میں سیرت النبی میں، خطبات مدراس اور دیگر کتابوں میں اس کو علمی زبان میں ثابت کیا ہے، اور یہ جو تناقض و تضاد بتایا جاتا تھا، اس کو دفع کیا ہے۔

بس میرے عزیزو! آپ کو علمائے ربانیین کا نمونہ

(باقی ص ۵۳ پر)

حضرت قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ کی

مجاہدانہ زندگی

تحریر: پروفیسر محمد اجتبا ندوی

حضرت قاری صدیق احمد بندیل کھنڈ کے شہر باندہ (یوپی) سے دس میل کے فاصلے پر مشرق میں ایک گاؤں، "حسین پور" (ہتھورا) میں غالباً ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، (یہ نام) حسین پور حضرت قاری صاحب کے خاندانی بزرگ سید حسین احمد کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن انہیں کی ایک کرامت کی وجہ سے ہتھورا کے نام میں تبدیل ہوگیا اور اسی نام سے مشہور ہوا، یہ حسینی واسطی سادات کی بستی ہے، آس پاس کہیں کہیں تھوڑی بہت مسلم آبادی ہے، اس میں یہ خاندان تعلیم و تربیت، دعوت و اصلاح اور افتاء و قضاء کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے بندیل کھنڈ کے اس پسماندہ علاقہ میں ایمان و یقین اور علم و عمل کا (جزیرہ) ہتھورا مینارۂ نور، شمع فروزاں، مشعل راہ اور اصلاح و تقویٰ سے مشک بار و بہار آفریں اور ضوفشاں مرکز تھا، اسی روح پرور بستی میں حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ نے اپنے والد سید احمد صاحب اور اپنے دادا کے زیر سایہ پرورش پائی ابتدائی تعلیم کا آغاز دادا مرحوم ہی نے کرایا اور آٹھ پارے حفظ کرانے کے بعد مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب کے یہاں پانی پت روانہ فرمایا، دادا نے تعلیم اور حفظ کی بنیاد اتنی مستحکم کردی تھی کہ وہ آئندہ تعلیم میں امتیازی مقام حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوئی، خود فرماتے تھے کہ دادا مرحوم نے جو آٹھ پارے حفظ کرائے تھے وہ سب سے زیادہ پختہ اور رواں ہیں، زیادہ مراجعہ کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ عربی تعلیم کے لئے پانی پت، کانپور اور دہلی بھی تشریف لے گئے۔ تعلیم کی تکمیل کے لئے خود ہی مظاہر علوم سہارنپور کا انتخاب فرمایا، یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ "دار قدیم" کے پھاٹک میں داخل ہوتے وقت دو اور طالب علموں پر نظر پڑی جو اسی پھاٹک سے اندر پہنچے تھے اور پھر تینوں نہ صرف ہم درس ہوئے بلکہ اخلاص و وفا، علم و عمل، اور دین و دعوت کی راہ میں زندگی بھر کے رفیق و ہمدم اور دوست و ہم راز بن گئے، ان میں سے ایک خانوادۂ حضرت سید احمد شہید سے وابستہ اور مفکر اسلام، عالم جلیل و مربی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے

بھانجے مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے حضرت سید شہید ہی کے خلیفہ اجل حضرت مولانا سید جعفر علی صاحب کے پڑپوتے حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ تھے، تینوں ایک ساتھ رہتے، ایک ساتھ پڑھتے۔ اور یکساں پروگرام ومنصوبہ بناتے، مظاہر علوم کے اساتذہ سے گہرا تعلق رکھتے، لیکن بعض حالات کی بنا پر تینوں کی بیعت کا تعلق الگ الگ بزرگوں سے قائم ہوا، مولانا محمد ثانی نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سے اور مولانا سید محمد مرتضیٰ نے حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوری سے اور مولانا قاری سید صدیق احمد نے حضرت مولانا اسعد اللہ سے بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے، اپنی سعادتمندی، سادگی، درویشی، قلندری اور حصول علم میں محنت، شغف اور لگن کی وجہ سے اساتذہ اور رفقاء درس میں بے حد مقبول اور قدر ومحبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں امتیازی نمبروں سے تعلیم مکمل کی اور سند فراغت حاصل کی، شہر گونڈہ (یوپی) میں ایک مدرسہ فرقانیہ ہے اس کی دعوت پر تدریس کے لئے تشریف لے گئے، مگر تھوڑی ہی مدت قیام کرکے مدرسہ اسلامیہ فتح پور منتقل ہو گئے۔ شہر فتح پور ان کے اپنے وطن باندہ سے قریب بھی تھا اس وجہ سے اسے ترجیح دی اپنی ممتاز علمی صلاحیت اور بے مثال دعوتی واصلاحی جذبہ، صالح کی اعلیٰ اقدار، سادگی اتباع سنت، تبلیغی جوش، بلا امتیاز خدمت خلق کے لئے تڑپ وبے چینی کی بنا پر نہ صرف اس شہر بلکہ اس پورے علاقہ اور پھر پورے ملک میں جلد ہی معروف ومشہور ہو گئے۔ اور تشنگان علم کے پہلو بہ پہلو خلق خدا کے رجوع بلکہ ہجوم کا آغاز ہو گیا، اسی اثنا میں ملک ووطن پر مسرت اعلان آزادی کی چھاؤں میں ایک بڑے دردناک، غم انگیز اور ناقابل تلافی نقصان وسانحہ تقسیم سے دوچار ہو گیا، عزیز وطن کا دامن، لہراتے ہوئے ترنگے جھنڈے کے سایہ میں جگمگاتے ہوئے قمقموں کی تیز روشنی میں، چمیلی وجوہی اور گلاب کی بھینی بھینی خوشبوؤں اور شیریں وبہار آور ہلکی دھنوں اور مترنم نغموں کے درمیان معصوم وبے گناہ انسانوں، عورتوں، بچوں بچیوں کی آہ وفغاں، گریہ وزاری، فریاد ومدد طلبی اور گہرے نہ بھرنے والے زخموں سے خون آلود ہو گیا، بہتے ہوئے خونوں کے چھینٹوں نے وطن کے کونے کونے کو رنگین وبدنما بنا دیا۔ اس سے حضرت مولانا صدیق احمد کی جائے پیدائش ہتھورا اور اس کا جوار بھی محفوظ نہ رہ سکا، ابھی یہ زخم بھرا ہی تھا کہ ۱۹۵۰ء میں زبانی اور اخبارات کے ذریعے ارتداد کی تشویشناک خبر پہنچی، مولانا کا دردمند دل بے چین ہو گیا اور آپ اس سیلاب بلا پر باندھ باندھنے کے لئے باندہ روانہ ہو گئے اور مدرسہ اسلامیہ سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

باندہ، ہتھورا اور اس کے دیہی علاقوں واطراف واکناف کا تبلیغی واصلاحی دورہ کرنا شروع کیا، دین وعقیدہ اور احکام الٰہی سے بیگانہ افراد ناواقفیت، دہشت، خوف اور روشن مستقبل کے سنہرے وعدوں کے زیر اثر دین اسلام کو چھوڑ رہے تھے یا مائل بہ ارتداد تھے،

مولانا باندوی کی حکیمانہ تقریروں، ہمدردانہ گفتگو، برادرانہ برتاؤ اور مخلصانہ تعاون نے سہارا دیا جس سے یہ بڑھتا ہوا سیلاب تھم گیا، مولانا دن بھر آباد کرنے، بسانے، جوڑنے، سکھانے پڑھانے، تعلیم و تبلیغ کرنے اور تعمیری منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی جدوجہد کرتے اور رات کو بارگاہ الٰہی میں رو رو اور گڑگڑا کر دین پر ثابت قدمی، استقامت، صحیح عقیدہ اور اسلامی اقدار کے بقاء و تحفظ کیلئے دعا کرتے کہ بار الٰہا! دلوں کے پھیرنے والے ان تردد میں ڈوبے ہوئے اپنے بندوں کے دلوں کو اپنی طاعت پر قائم رکھ اور اے دلوں کے بدلنے والے اپنے بندوں کے قلوب کو اپنے دین کی جانب پھیر دے۔

مولانا کی جانکاہ کوشش، ایثار و قربانی، جانفشانی وفاقہ کشی اور شب بیداری و آہ سحرگاہی رنگ لائی، خطہ کے عوام و خواص نہ صرف دین پر قائم رہے بلکہ جو جو منھ موڑ کر دور جاچکے تھے وہ دین کا رخ کرکے واپس آنے لگے، اپنے بچوں اور نونہالوں کو ان کے سپرد کردیا کہ انھیں دین کی تعلیم دیں اور دینی و اسلامی ماحول میں رکھیں، حالات میں سکون آچکا تھا، فضا بدل گئی تھی، ہر مذہب و ملت اور طبقے کے لوگ مولانا سے مانوس ہوگئے تھے اور انہیں ان کا مکمل اعتماد حاصل ہوگیا تھا، مولانا ان بچوں کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں ہتھورا پہنچے، اپنا آبائی مکان کچا اور چھوٹا و تنگ تھا، گاؤں کی آبادی مختصر تھی، کاشت کی زمین بھی محدود تھی، ایک چھوٹا سا میدان تھا، اس کے بعد خودرو جنگل کا طویل سلسلہ تھا، بچوں کو لاتے وقت ذہن میں تھا کہ کسی بڑے دینی ادارہ میں انہیں داخل کردیں گے، لیکن تبلیغی گشت اور اصلاحی مصروفیات نے سفر کی اجازت نہ دی، ان بچوں کو مانوس و مشغول رکھنے اور وقت بچانے کیلئے خود ہی ان کو پڑھانا شروع کردیا، ایک چھوٹا سا کچا کمرہ تھا، اسی میں قیام ہوتا تھا انہیں حالات میں خیال آیا کہ صرف تبلیغی گشت اور وقتی تقریریں دینی استحکام اور معاشرتی اصلاح کے لئے کافی نہیں ہے اس کے لئے مدارس و مکاتب کا قیام اور دینی تعلیم کا باقاعدہ نظم ضروری ہے، چنانچہ ہتھورا میں انھیں بچوں سے ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں ادارہ قائم کردیا اور انکی فراست ایمانی، دوراندیشی یا کرامت تھی کہ اس دور میں اس ادارہ کا نام (جامعہ عربیہ) رکھا جبکہ یہ نام اس وقت دینی مدرسوں کیلئے قطعی نامانوس تھا، ان کا مقصد ایک مرکزی جامعہ قائم کرکے اس علاقہ میں اسکی شاخیں قائم کرنا تھا، چنانچہ اب خاص حد تک ان کا یہ منصوبہ روبہ عمل آچکا ہے۔ اور بہت سے مکاتب و مدارس قائم ہوچکے ہیں۔ گاؤں کے چودھری نے گاؤں کی چوپال کے ایک حصہ میں طلبہ کے رہنے اور پڑھنے کی اجازت دیدی، جامعہ کے قیام کی خبر سن کر کچھ اور طلبہ فتح پور سے آگئے جو درس نظامی کا نصاب پڑھ رہے تھے، اس لئے تعلیم کے کچھ درجے مسجد میں ہونے لگے، کبھی درختوں کے نیچے اور بارش نہ ہونے کی صورت میں اس کھلے میدان میں بھی پڑھائی ہوتی جس میں حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب پانی پتی اور ان کے بعد ان کے صاحبزادگان کی تشریف آوری سے مجلسیں منعقد

ہوا کرتی تھیں، بعد میں ایک صاحب نے کچھ زمین عنایت کردی اور یہ میدان بھی شامل کرکے کمروں کی تعمیر شروع کرادی گئی۔

مولانا صدیق احمدؒ جامعہ عربیہ، اور اساتذہ وطلبہ کے لئے یہ دور بے حد صبر آزما، تکلیف دہ، پریشان کن اور شدید ترین آزمائشوں کا تھا، قیام، طعام، تعلیم اور کتابوں کی فراہمی ہر ایک میں قدم قدم پر بے بسی، بے چارگی، بے مائیگی اور دشواری کا سامنا تھا، فاصلے طویل تھے، راستے دشوار گزار خطرناک اور جان لیوا تھے، مزید برآں تلخ نوائی، و آبلہ پائی، برسات کے موسم میں تو پناہ گاہیں بھی اپنی تنگ دامانی پر خود ہی شکوہ سنج ہوتیں، حضرت اپنے رفقا وطلبہ کیساتھ بڑے صبر وسکون، تحمل وحلم، تدبر وحکمت اور عزم وحوصلہ کے ساتھ سب کچھ جھیلتے رہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جامعہ عربیہ ملک کا ایک عظیم ادارہ بن چکا ہے۔

جامعہ عربیہ کے کچے حجروں سے لیکر آج کی پختہ، شاندار وعالیشان مسجد وعمارتوں تک تعمیر ونقشہ میں حضرت قاری صاحب نے براہ راست حصہ لیا، مسجد، درسگاہ، دارالاقامہ، اساتذہ کی قیامگاہیں جتنی کچھ بھی تعمیر ہوئیں انمیں تعلیمی و تربیتی مہارت وتجربہ کو پیش نظر رکھا، جسکا مشاہدہ احساس دلادیتا ہے کہ ہر ایک کا اپنا مقصد اور کام ہے۔ بزرگوں اور اکابر ملت کے تاثرات ومعاینے بھی اس کے شاہد ہیں۔ نصاب وتدریس درس نظامی کے دائرہ میں ہے لیکن اس کی ترتیب میں حکمت واجتہاد سے کام لے کر زیادہ مفید ونفع بخش بنادیا گیا۔ پورا نصاب درجات میں تقسیم کرکے جہاں سے جو آبدار موتی اور تابناک ہیرے ملے پرودیے گئے، اس سے پورا نظام جگمگا اٹھا اور قندیل رہبانی کا کردار ادا کرنے لگا۔

انہوں نے نصاب کی کتابوں کو مفید تر بنانے کے لئے ایک جدید طریقہ اپنایا جو انکی فکری بصیرت، تعلیم، تجربہ اور دور اندیشی کا آئینہ دار ہے، یہ مضامین کے سہل بنانے کا طریقہ ہے انہوں نے بنفس نفیس اپنی تمامتر مصروفیات وذمہ داریوں کے ساتھ کم از کم سات مضامین کو آسان بناکر نصاب میں داخل کیا اور باقی مضامین کا کام اپنے ادارہ کے ایک معتمد استاذ عزیز القدر مفتی عبید اللہ اسعدی کے سپرد کیا، جنہوں نے اپنی علمی وتصنیفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے چند معیاری کتابیں اسلامی علوم سے متعلق تصنیف کیں اور قلم کے جوان ہونے کیوجہ سے اس میں زور بھی ہے اور روانی بھی، مولانا نے اپنے جامعہ کو سلف صالح کے درس ومنہج پر قائم رکھتے ہوئے تعلیم کو بارہ شعبوں میں تقسیم کردیا اس سے تعلیمی نظام ومعیار کو بلند اور زمانہ کے مزاج وروح کے مطابق ڈھالنے کی راہ ہموار ہوئی، اور طلبہ کی نگرانی ومثالی تربیت کرنے میں سہولت بھی حاصل ہوگئی۔ حضرت مولانا نے جامعہ سے دور گاؤں میں نسواں اسکول (مدرسہ) بھی قائم کیا اور اسکی عمارت ایسی تعمیر کروائی کہ پردہ کے ساتھ بچیوں کے لئے ہر طرح کی آسانیاں حاصل رہیں ان کا یقین تھا کہ بچیوں اور عورتوں کی تعلیم سے گھر، خاندان اور معاشرہ صالح دینی اور ثقافتی بنیادوں پر قائم ہوگا اور اس سے ماں کی گود ہی سے داعی ومصلح تیار ہونا شروع ہوجائیں گے

مولانا صدیق احمد صاحب کو فیاض ازل نے بے پایاں محاسن و خوبیوں سے نوازا تھا بچپن سے سادگی، نرم خوئی، تواضع، لطافت، نفاست سے مالا مال، دینی فرائض و واجبات کے بڑے اہتمام کے ساتھ پابند تھے، دینی تعلیم حاصل کی، بزرگوں کی صحبت میں رہے، تعلیم، دعوت، اصلاح، ریاضت، مجاہدہ اور شیخ وقت و مرشد کی تربیت و نگاہ کیمیا اثر نے نبوی اخلاق اور پیغمبرانہ صفات پیدا کردیں، صرف عبادات ہی نہیں، معاملات، اخلاقیات اور عام زندگی کے برتاؤ و لین دین میں اتباع سنت اور اسوۂ رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر عامل وکاربند تھے، جس نے فرشتہ خصلت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی تصویر بنادیا تھا، یہ زبان زد خلائق تھا کہ انھیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے اور انکے ساتھ چند لمحے گذار کر ایمان تازہ ہوتا ہے اور عمل صالح کا جذبہ موجزن ہوجاتا ہے، اسی نے انہیں خلق خدا میں بے انتہا مقبول بنادیا تھا جدھر سے گزرتے بہار آجاتی، اور ایک زبردست ہجوم جمع ہوجاتا، ہر ایک کو دعا دیتے اور تعویذ لکھتے۔ کسی کو مایوس نہ کرتے، بزرگوں اور اکابر کا بھی قدر و احترام کرتے دیکھا اور سنا، خود ان کے مرشد و استاذ مولانا اسعد اللہ صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر آخرت میں اللہ عزوجل نے پوچھا کہ کیا لائے؟ تو عرض کردوں گا کہ (صدیق) کو لایا ہوں، ان کے استاذ گرامی مرتبت حضرت مفتی محمود حسن فرمایا کرتے تھے کہ حشر میں اگر سوال ہوگا کہ کیا لے کر آئے ہو؟ تو کہہ دوں گا (صدیق ذابرار) کو لے کر آیا ہوں۔

ایسے ہی بلند کلمات ان کے بارے میں بہت سے معاصرین سے سنے گئے اور یہ کہ ان جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ نصاب کی کتابوں کی تسہیل کا کام خود شروع کیا تھا اور ان تمام تر مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف اور رسالے بھی ترتیب دیئے، چند نام ملاحظہ ہوں۔

۱۔ شرح بخاری ۲۔ سیرت سید المرسلین ۳۔ آداب معلمین، ۴۔ آداب المتعلمین ۵۔ حق نما ۶۔ فضائل نکاح ۷۔ احکام المیت ۸۔ فضائل علم ۹۔ التسہیل السامی فی حل شرح الجامی ۱۰۔ تسہیل المنطق ۱۱۔ تسہیل التجوید ۱۲۔ تسہیل النحو ۱۳۔ تسہیل الصرف ۱۴۔ اسعاد الفہوم شرح سلم العلوم ۱۵۔ شرح شرح تہذیب، ان کے علاوہ صہبائے مدینہ کے نام سے نعتیں ہیں اور کچھ نظمیں بھی کہی تھیں، (ثاقب) تخلص تھا۔

اہلیہ محترمہ کا چند سال قبل انتقال ہوچکا تھا، بڑی صالحہ نیک و فیاض خاتون تھیں، اولاد میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں اور سبھی صالح، نیک اور سعادتمند ہیں، تینوں صاحبزادگان عالم اور والد بزرگوار کے نقش قدم پر ہیں، مولانا سید حبیب احمد، مولانا نجیب احمد اور مولانا حسیب احمد، جامعہ ہی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، تواضع انکسار اور بے نفسی کی زندہ مثال ہیں۔

بشکریہ

ہفت روزہ نئی دنیا ۲۳ تا ۲۹ ستمبر ۱۹۹۶ء

مولانا عبدالعلی فاروقی
مہتمم دارالعلوم فاروقیہ کاکوری، لکھنؤ

منزلوں کے سہارے گئے

۲۸ اگست ۱۹۹۶ء کی خبروں میں ایک خبر ایسی تھی جس نے بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار انسانوں کے دلوں کو غمگین کر دیا۔ عارف باللہ اور محبوب انام حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ باندوی کی وفات کی خبر واقعی ایسی اچانک تھی کہ بس سننے والے سنتے اور سر دھنتے رہ گئے اور اب حال یہ ہے کہ ؎

دل میں یادِ غمِ بیکراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

راقم الحروف کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ذاتی فضل و کمال کے حوالے سے اس کی جھولی میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن تحدیثِ نعمت کے طور پر اس فضل خداوندی کے ذکر میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ ایک علمی خانوادہ سے نسبی تعلق کی وجہ سے اسے بہت سے باکمالوں سے ملاقات کرنے، ان کے فضل و کمال کا مشاہدہ کرنے اور بقدر ظرف ان سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملے ہیں اور اپنے اس محدود مشاہدہ و تجربہ کی بنیاد پر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ کا حال اور رنگ سب سے جدا، سب سے نرالا اور سب سے البیلا تھا جسے سمیٹ کر دو حسین عنوان دیئے جا سکتے ہیں یعنی انکساری و بے نفسی اور غم سوزی و غم گساری۔

حضرت قاری صاحبؒ یقیناً ایک کامل الاستعداد عالم تھے مگر ایسا نہیں کہ ان کے بعد ان جیسی استعداد و صلاحیت کے عالموں سے دنیا خالی ہو گئی ہو۔ وہ ایک دردمند ہادی و مرشد تھے مگر بفضلہ تعالیٰ ہمارے سروں پر ابھی ان بزرگوں کے ظل عاطفت موجود ہیں جن کو حضرت قاری صاحب مرحوم بھی اپنا بڑا اور رہبر مان کر ان کی خدمت میں بار بار حاضری دیتے اور انکی دعائیں لیتے رہتے تھے مد اللہ ظلالھم و فیوضھم۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت قاری صاحب کی وفات کے بعد ہزاروں دلوں سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے ؎

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

بات بالکل سادہ اور قابلِ فہم ہے کہ بلند قامت اور بزرگ ہستیاں تو ہیں مگر اپنے کچھ اصول و معمولات کے ساتھ، انکی خدمت میں حاضری بھی دی جا سکتی ہے اور ان کے فیوض و برکات سے استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے

مگر ان کی اپنی کچھ شرطوں اور قیدوں کے ساتھ ...... جبکہ سہولت پسند انسانوں کا ایک انبوہ اس "مردِ درویش" کی شفقتوں اور عنایتوں کا خوگر ہو چکا ہے جس نے شہرت و مقبولیت کی قابلِ رشک بلندیوں پر پہنچ کر بھی اپنے کو پامال کرنے کا حوصلہ دکھایا۔ جس نے اپنی ذات اور اپنے نفس کی اس طرح نفی کی کہ نہ کھانے پینے کی پرواہ، نہ آرام و سکون کی طلب، نہ امراض کی فکر، نہ معالجین کی ہدایات کا لحاظ، نہ سفر کی سہولتوں کی تلاش، نہ حضر کی سہولتوں سے مطلب و واسطہ، نہ کسی سے بڑے ہونے کا احساس، نہ بڑائی کے کسی حق کا طلبگار بس فکر تھی تو اپنے خالق کو راضی رکھنے کی اور دھن تھی تو اس کی مخلوق کے کام آنے کی ؂

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ کے عقیدتمندوں اور ان کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہونے والوں میں سے کم ہی لوگوں کے علم میں یہ بات رہی ہو گی کہ خود حضرت مولانا کیسے کیسے پیچیدہ اور مکلف امراض میں مبتلا رہے، کیونکہ ان کے صابرانہ و قلندرانہ مزاج نے گوناگوں امراض اور ان کی تکالیف کو بھی ان کی حرکت اور نفع رسانی کی راہ کا روڑا نہیں بننے دیا۔ ابھی وفات سے چند ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا اپنی ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہونے والی شدید تکلیف کے علاج کے لئے لکھنؤ کے سحر نرسنگ ہوم میں آکر داخل ہوئے اور حسبِ معمول ان کی لکھنؤ میں آمد اور موجودگی کی خبر ہوا کے دوش پر پھیل گئی اور ان کی ایک جھلک دیکھنے، عیادت کرنے، اور مصافحہ کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ہی اس حال میں بھی ان سے اپنی اغراض و پریشانیاں بیان کرکے تعویذ و دعا حاصل کرتے والوں کا تانتا بندھ گیا...... حضرت مولانا کی شدید تکلیف اور علاج کے تقاضے کے پیش نظر تیماردار دوں نے صرف اتنا چاہا کہ ملاقات کا وقت مقرر کر دیا جائے مگر انہوں نے سختی کے ساتھ یہ کہہ کر روک دیا کہ اللہ کے بندے نہ جانے کہاں کہاں سے اور کتنی مشقتیں برداشت کرکے آ رہے ہیں ان کے آنے اور ملنے پر کسی طرح کی پابندی نہ لگاؤ۔ پھر بھلا کتنے بندگان خدا اس بات کا صحیح طور پر احساس کر سکے ہوں کہ ان سے مصافحہ کرتے، بات چیت کرتے اور دعائیں دیتے ہوئے بار بار حرکت کرنے میں اس "مردِ خود فراموش" پر کیا کچھ نہ بیت گئی؟

حضرت مولاناؒ کے عقیدتمندوں اور انہیں ٹوٹ کر چاہنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ بھی ہے جو انہیں بڑے پیار سے "بابا" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ ان غیر مسلم عقیدتمندوں میں وہ بھی ہیں جنھوں نے "اپنے بابا" کے کہنے سے شراب چھوڑ دی وہ بھی جو "بابا" کے عقیدتمند ہونے سے پہلے ڈاکے ڈالا کرتے تھے اور وہ بھی جو اپنے مقدمات میں کامیابی اور مشکلات کے حل کے لئے "بابا" سے دعا کراتے، تعویذ لیتے اور پانی دم کرا کے پیتے — متعدد دیگر مواقع کے علاوہ ایسے کئی عقیدتمندوں کو

راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے اس وقت بھی دیکھا
جب حضرت مولاناؒ کی اہلیہ مرحومہ کی وفات کے دوسرے
دن اس نے ہتھورا حاضری دی، رفیق زندگی کی اچانک
جُدائی پر مولاناؒ صدمہ سے چور لیکن پیکر صبر و رضا بنے بڑی
خندہ روئی کے ساتھ تعزیت کے لئے آنے والے مہمانوں
کی دیکھ ریکھ اور خاطر مدارات میں لگے ہوئے تھے۔
مہمانوں کی اس بھیڑ میں اچھی خاصی تعداد ان ضرورت مندوں
کی بھی تھی جو تعزیت کے ساتھ ساتھ کچھ اور مقاصد بھی
لے کر آئے تھے۔ اور حضرت مولاناؒ کی مہمان نوازی
کا یہ نرالا انداز کہ ذرا سی فرصت ملتے ہی مدرسہ کے ایک
استاذ کو حکم دیا کہ "تعویذ لینے والے مہمانوں" کو بلا لو،
ان "مہمانوں" میں کئی غیر مسلم حضرات بھی تھے جو آتے
گئے اور تعویذ لیتے گئے، ان میں وہ بوڑھا شخص بھی
شامل تھا جس کے بدن پر گیروا لباس، چہرہ پر داڑھی
اور پیشانی پر قشقہ کھینچا ہوا تھا اور اس نے دونوں
ہاتھ جوڑ کر معذرت کے ساتھ کہا تھا "بابا کل سے آپ
جتنی پریشانی میں ہیں وہ ہمیں معلوم ہے مگر کل ہی
ہمارے مقدمہ کی پیشی ہے اس لئے آپ سے تعویذ
لینا ضروری تھا" اور "بابا" نے جو صرف ایک دن
پہلے ہی اپنی وفا شعار، ایثار پیشہ اور انتہائی مہمان نواز
اہلیہ کی اچانک جدائی کے صدمہ سے ٹوٹے اور بکھرے
ہوئے تھے بڑے حوصلہ کے ساتھ کہا کہ نہیں نہیں کوئی
بات نہیں، دنیا کے سب کام چلتے رہتے ہیں! اور پھر
اپنے اس بوڑھے مہمان کو تعویذ دیکر اسے خوش کردیا

اس خوش کرنے، دل رکھنے اور اللہ کی مخلوق کے کام
آنے کی دھن میں حضرت مولانا کیا کیا جھیلتے تھے اور
کس کس طرح اپنے کو جوکھم میں ڈالتے تھے؟ اس کا اندازہ
بس اسی ایک حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ہفتہ میں شاید
ہی کوئی ایک دن ایسا آپاتا ہو کہ وہ ۲۴ گھنٹوں میں
صرف ۴ گھنٹے سکون کے ساتھ بستر پر آرام کرسکیں۔ وہ
دینی مدارس، دینی اداروں، اور دینی شخصیات کی دعوت
اور انکی ضرورت پر ہر سال بلامبالغہ سیکڑوں سفر کرتے
تھے، مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ نہ سواری کا مطالبہ، نہ
سفری سہولیات کا، نہ کرایہ کی طلب، نہ کسی رفیق سفر
کو لے کر چلنے کا التزام۔ ریل کا سفر ہو تو سب سے کم
کرایہ والا دوسرا درجہ پسندیدہ اور اس سے اوپر کے
درجہ میں اپنا سفر "فضول خرچی" میں شمار، ٹرک کا سفر ہو
تو محبوب ترین سواری ٹرک کیونکہ یہ ہر وقت اور ہر جگہ
مل جاتی ہے، دیہات کا سفر ہو تو نہ پیدل چلنے میں کوئی
تکلف نہ سائیکل کے کیریر پر بیٹھ جانے میں کوئی عار۔
اور اب بیماری، ضعف، اور معذوری کا لحاظ کرتے ہوئے
بلا طلب اور بلا اطلاع اپنی سواری لیکر پہنچ جانیوالوں
سے شرماشرما کر اور بڑی عاجزی کے ساتھ یہ شکوہ کہ
آپ نے بلا وجہ زحمت کی اور غیر ضروری اخراجات
برداشت کئے، حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ ہماری
اس فانی دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کی یہی وہ
مخصوص ادائیں ہیں، جنہیں انکے جاننے والے اور چاہنے
والے ڈھونڈھ رہے ہیں اور شاید ڈھونڈتے ہی رہ جائیں

باقی ص ۹۵ پر

تعزیتی جلسہ

کی

کارگذاری

حضرت شیخ مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ

مورخہ ۳۱، اگست ۱۹۹۷ء بروز اتوار بعد نماز مغرب مسجد نور مانچسٹر میں زبیر صاحب بدات کی کوشش سے عارف باللہ قطب عالم حضرت شیخ مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر ایک عظیم تعزیتی جلسہ حضرت مولینا مفتی اسمٰعیل کچھولوی صاحب خلیفہ قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رح کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص حضرت مولانا محمد ایوب صاحب سورتی کھلوڈیا صاحب خلیفہ حضرت اقدس مولانا سید نفیس احمد رضوی صاحب دامت برکاتہم نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ حضرت باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے آباو اجداد سینکڑوں سال پہلے سرزمین عراق سے واردِ ہند ہوئے، آپ کا خاندان سادات حسینی سے تعلق رکھتا ہے۔

آپنے ابتدائی تعلیم پانی پت اور کانپور میں حاصل فرمائی۔ ان مدارس میں گھریلو حالات کمزور ہونے کی بنا پر اور پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے مولی اور بھاجی کے پتیوں کو پانی میں ابال کر کھا لیا کرتے تھے۔ اور کپڑے بھی صرف ایک جوڑی تھے، اسی کو دھو کر سکھا کر پہن لیا کرتے تھے پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہو کر درس نظامی کی تکمیل فرمائی، جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ناظمِ اعلیٰ ولیِ کامل حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجدد ملت حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت وخلافت بھی حاصل فرمائی تھی، پھر قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے مادرِ وطن ہتورہ (ضلع باندہ) میں دار العلوم کی بنیاد رکھی،

الحمد للہ آج وہاں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے اور سینکڑوں علماءِ کرام آج وہاں سے فارغ ہو کر ملک و بیرون ملک میں ملت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد صدرِ جلسہ حضرت مولانا مفتی محمد اسمٰعیل کچھولوی صاحب مدظلہ نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ فقیہ الامت حضرت اقدس مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال فرمائے کہ: اے محمود دنیا سے کیا لے کر آئے ہو" تو میں اللہ تعالیٰ کو یہ جواب دوں گا کہ "اے بار الٰہا میں حضرت مولانا سید صدیق احمد باندوی اور سید الابرار حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی صاحب کو لے کر آیا ہوں یعنی ان دونوں شاگردوں کی عند الناس اور عند اللہ مقبولیت اور ان کی خدمات کو میری نجات کے لئے آپ کی بارگاہِ عالی میں پیش کرتا ہوں اس کے بعد جانشین شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ محدثِ ہند حضرت اقدس مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک سوانح پر روح پرور بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حضرت کی ذات گرامی صرف ہند کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا والوں کے لئے ایک نعمتِ عظیمہ تھی، عربی درس نظامیہ پر اتنا عبور تھا کہ کسی وقت کسی استاد کی غیر حاضری پر ان کی جگہ بیٹھ کر وہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے اسی کا درس شروع فرما دیتے تھے۔ اور فرمایا کہ دنیا سے بے رغبتی اور فنائیت کا اتنا غلبہ تھا کہ آج ان کی مثال ملنا مشکل ہے، حضرت مدنی صاحب مدظلہ نے بہت ہی صدمہ اور افسوس کے ساتھ فرمایا کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی اللہ کے نیک بندے کا وصال ہوتا تھا تو ان کی جگہ دوسرے اکابر پُر کرتے تھے مگر آج اس حالت سے گذر رہے ہیں جو اولیاء اللہ چلے جاتے ہیں انکا خلاء پُر کرنیوالا کوئی نظر نہیں آتا یہ ہمارے لئے بڑے افسوس کی بات ہے۔

حضرت مدنی مدظلہ کے بعد مناظر اسلام حضرت علامہ خالد محمود صاحب مدظلہ کے درد بھرے بیان اور دعا پر جلسہ ختم ہوا۔ پوری مسجد سامعین سے بھری ہوئی تھی، علماء کرام کی تعداد زیادہ تھی، مانچسٹر کے علاوہ باٹلی براڈفورڈ بولٹن بلیکبرن فینی فون لندن وغیرہ سے دور مقامات سے متعلقین نے آکر شرکت فرمائی، اور باہر سے آنیوالے سارے مہمانوں کے طعام وقیام کا پورا انتظام حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے سالِ گذشتہ دورۂ برطانیہ کا پہلا اور آخری پانچ دن کا سفر مبارک کے میزبانِ خاص قاری۔ زبیر بدات صاحب نے اپنی طرف سے فرمایا تھا۔ آخر میں قارئین حضرات سے التماس ہے کہ حضرت باندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی مخلصانہ دعاؤں میں یاد فرماتے رہیں، اللہ جل شانہٗ ان کی روح کو اپنی رحمت اور رافت کی بدلیوں میں ڈھانپ لے اور جنت کے اعلیٰ مقاماتِ فردوس سے نوازے، نیز ان کی رحلت سے پیدا ہوئے مہیب خلاء کو اپنی قدرت کاملہ سے پُر فرمائے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

قارئین ...... سے اسلام کے اس مخلص خادم کے حق میں ایصالِ ثواب کی بجانہ درخواست ہے۔

والسلام

(مولوی) محمد یوسف مدنی لاجپوری، باٹلی برطانیہ۔

مولانا محمد زکریا سنبھلی
استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

باتیں انکی یاد آتی ہیں بہت

اولیں ملاقات اور پھر مولانا کے یہاں حاضری

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کا تذکرہ تو طالب علمی کے ابتدائی زمانہ ہی میں کانوں میں پڑ گیا تھا۔ میری طالب علمی کا دوسرا یا تیسرا سال تھا اب مجھے مزید پڑھنے کے لئے اپنے وطن سنبھل سے باہر کہیں جانا تھا۔ عم محترم حضرت مولانا نعمانی نے دو مدرسوں کے نام تجویز فرمائے تھے ایک بہرائچ کا مدرسہ نور العلوم اور دوسرا حضرت مولانا سید صدیق احمد کا مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہتھورا، ضلع باندہ۔ بعض ترجیحات کی بناء پر فیصلہ نور العلوم جانے کا ہوا تھا۔ مدرسہ نور العلوم میں بھی مولانا کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ ہم لوگوں کے امتحان کے سلم العلوم اور مختصر المعانی کے پرچے مولانا نے ہی بنائے تھے اور کاپیاں بھی وہیں جانچنے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ بس اتنی ہی واقفیت مولانا اور ان کے مدرسہ کی تھی۔ عم محترم حضرت مولانا نعمانی کی زبان سے کبھی کبھی مولانا کے تقوے، للہیت اور سادگی کا ذکر بھی سنا تھا۔ نور العلوم سے مختصر المعانی، شرح وقایہ وغیرہ پڑھ کر میں دار العلوم دیوبند چلا گیا۔ وہاں تین سال پڑھنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں درجہ تخصص فی الادب کے دو سالہ نصاب میں داخلہ لے لیا۔ ندوہ میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا۔ امتحان میں ابھی چند مہینے باقی تھے، ندوہ کی مسجد میں ایک تبلیغی اجتماع تھا اس میں شرکت کے لئے حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحبؒ تشریف لائے تھے۔ مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ لوگ ایک صاحب سے ملاقات کر رہے تھے۔ کسی نے بتلایا کہ یہ باندے کے مولانا صدیق صاحب ہیں۔ تذکرہ پہلے ہی سن چکا تھا۔ کسی قدر حسن اعتقاد

بھی عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ کے ذریعہ سنی ہوئی باتوں سے دل میں گھر کئے ہوئے تھا۔
ملاقات ہوئی اور غالباً تعارف بھی۔ اسی دن تھوڑی دیر کے بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مکتبہ
میں اپنے محسن اور دوست حافظ سمیع اللہ صاحب سے ملاقات کے لئے گیا۔ وہ اس وقت مکتبہ کے ذمہ دار تھے
۔ جیسے ہی میں نے مکتبہ میں قدم رکھا، دیکھا کہ حضرت مولانا وہاں تشریف فرما ہیں۔ میں نے سلام
کیا، آپ نے جواب دیا اور فوراً ہی حافظ سمیع اللہ صاحب نے بلا کسی تمہید کے کہا حضرت انھیں لے
جائیے۔ غالباً مولانا کو کسی مدرس کی تلاش تھی۔ حافظ جی نے تعارف بھی کرادیا۔
حضرت نے فرمایا ارے بھئی یہ بڑے آدمی ہیں ہمارے مدرسہ میں کہاں جا سکتے ہیں۔ میری
زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکلا حضرت آپ فرمائیں تو میں ابھی درمیان سال میں ہی تعلیم منقطع
کر کے آپ کے ساتھ چلوں فرمایا تعلیم مکمل کر لیجئے۔ اور آئندہ سال آجائیگا۔ لیجئے میری قسمت
کا ستارہ چمک گیا، اسے کہتے ہیں تقدیر خداوندی، آج ہی پہلی ملاقات ہوئی ہے اور آج ہی اللہ نے
مولانا سے وابستگی کا بھی فیصلہ کرادیا۔ تعلیمی سال کے اختتام پر جب میں لکھنؤ سے سنبھل جانے
لگا تو عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ نے آئندہ کے پروگرام کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے حضرت
سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا ذکر کر دیا۔ عم مرحوم نے فرمایا۔ مولانا تو اپنے ہی ہیں ان کو ہم بھی
خط لکھ کر یاد دہانی کرادیں گے۔ میں سنبھل چلا گیا۔ پندرہ بیس دن کے بعد عم محترم نور اللہ مرقدہ
کا ایک خط سنبھل پہونچا جس میں انھوں نے مولانا کے نام اپنے خط کا خلاصہ ــــ کہ مولوی
زکریا سے آپ کی اس طرح کی گفتگو ہوئی تھی۔ اگر آپ کے یہاں واقعی ضرورت ہو تو وہ خدمت
کے لئے حاضر ہیں۔ لیکن ان کے لئے جگہ نکالی نہ جائے ــــ مجھے لکھ کر بھیجا اور حضرت کا جواب
بھی مجھے بھیج دیا۔ حضرت کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ زکریا ہمارے مدرسہ میں پڑھانے کے لئے
آئیں۔ سر آنکھوں پر، لیکن ہمارے مدرسے میں یہ یہ نقص ہیں۔ مدرسہ دیہات میں ہے۔ شہری
سہولتیں بالکل نہیں ہیں۔ بجلی نہیں ہے، نائی دھوبی بھی نہیں، چائے والے کی دوکان نہیں،
راستہ مدرسہ تک کچا ہے، مکانات کھپریل کے ہیں، مطبخ کا نظام بہت خراب ہے، میرے گھر کے
حالات بھی اس طرح کے نہیں ہیں کہ میں کھانے کا کچھ مناسب نظم کر سکوں، مدرسین کی تنخواہ
بھی پچاس ساٹھ روپے ہے عم محترم نے اس خط کو دیکھنے کے بعد مجھے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا
کہ پہلے تو میری رائے تھی، لیکن مولانا کا خط پڑھ کر اب میرا خیال یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کرو کہ تم
ایسی جگہ رہ سکتے ہو یا نہیں۔ ادھر میں نے بھی مولانا کے خط کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ حضرت معذرت
ہی فرمانا چاہتے ہیں لیکن مجھے تدریس کی زندگی شروع کرنی تھی اور میرے پاس پڑھانے کے لئے

کوئی جگہ نہ تھی، اس لئے میں نے ایک سال کے لئے تو حضرت کے یہاں جانے ہی کا فیصلہ کرلیا اور غالباً بذریعہ خط عم مرحوم و مغفور کو بھی اس کی اطلاع دیدی، شوال کے آخر میں باندہ جانے کے ارادے سے ہی سنبھل سے لکھنؤ آیا۔ یہاں آکر ایک امتحان اور پیش آیا۔ حضرت مولانا نعمانی نے ایک اور مدرسہ کا بھی ذکر کیا اور فرمایا، وہاں ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ ہوگا۔ لیکن رمضان میں مدرسہ کا کام بھی کرنا ہوگا۔ ادھر مولانا کی نیکی اور تقوے کا بھی ذکر کیا۔ کہاں مولانا کے یہاں کے ۵۰، ۶۰ روپے تنخواہ اور کہاں اس مدرسہ میں ڈھائی سو روپے۔

لیکن الحمد للہ فیصلہ مولانا کے مدرسہ میں جانے ہی کا ہو گیا اور غالباً شوال کی ۲۶ یا ۲۷ تاریخ کو حضرت حافظ محمد اقبال صاحب گونڈوی کے ہمراہ باندہ چلا گیا عم محترم نے حضرت حافظ صاحب کو میری رہنمائی کے لئے بھیجا تھا۔ مدرسہ جا کر اندازہ ہوا کہ حضرت نے جو کچھ اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا تھا اس میں ایک لفظ بھی خلاف واقعہ نہ تھا۔

روانگی کے وقت عم محترم مولانا نعمانیؒ نے کچھ نصیحتیں فرمائی تھیں۔ جو زندگی بھر کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوئیں حضرت نے فرمایا مولانا کے ہر کام میں ہاتھ بٹانا مالیات میں دخل نہ دینا۔ آدمی ابتداء میں خیانت کی نیت نہیں کرتا ہے۔ بعض اوقات مجبوراً وانجام کار خیانت کرنی پڑ جاتی ہے۔ الحمد للہ میں نے اس نصیحت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ دوسری بات حضرت مولانا نعمانی صاحب نے یہ کہی تھی کہ مولانا اگر کتابوں کے بارے میں تم سے دریافت فرمائیں کہ تم کیا پڑھانا چاہتے ہو تو میرے حوالہ سے تم یہ عرض کر دینا کہ مدرسہ کی مصلحت اور ضرورت جو بھی ہو میں اسی کے مطابق کتابیں پڑھانے کیلئے تیار ہوں لیکن جب آپ دریافت فرماتے ہیں تو میری خواہش یہ ہے کہ ہر فن کی ابتدائی کتابیں مجھے عنایت فرمادیں۔ اور ایک کتاب اوپر کی ہدایہ یا شرح وقایہ دیدیں تاکہ نیچے سے بھی استعداد پختہ ہوتی رہے۔ اور اوپر کی کتابوں سے بھی تعلق برقرار رہے۔

مدرسہ حاضر ہونے کے بعد تین دن تک مولانا نے مہمان محض بنائے رکھا، میرے عرض کرنے پر بھی فرمادیا کہ پڑھانا تو ہے ہی، ابھی دو تین دن ذرا آرام کرلیں۔ ان تین دنوں میں مولانا نے ہمہ وقت مجھے اپنے ساتھ رکھا باندہ شہر تشریف لے جانا ہوا تو بھی ساتھ لے گئے اس پیکر شفقت و محبت کو دیکھنے کا مجھے پہلا موقع نصیب ہوا تھا۔ جو شفقت و محبت اس وقت ملی الحمد للہ تاحیات باقی رہی، کبھی ایک لمحہ کو بھی انقطاع نہیں ہوا۔

تین دن کے بعد مجھے کتابیں پڑھانے کے لئے دے دی گئیں۔ ہر فن کی ابتدائی کتابیں

اور شرح وقایہ اول و دوم میرے لئے منتخب فرمائیں۔ لیکن ابتدائی کتابیں بھی ایسی نہیں جو مدرسوں میں بے وقعت سمجھی جاتی ہیں۔ ابھی پہلے سال کے چند مہینے ہی گذرے تھے کہ مجھے تفسیر جلالین کا کچھ حصہ بھی پڑھانے کے لئے دیدیا اور دوسرے سال تفسیر بیضاوی مجھ سے پڑھوا دی اس کے بعد تو درجہ بدرجہ کتابیں اونچی ہی کرتے گئے۔

میری مدرسی کا غالبا چوتھا یا پانچواں سال ہی تھا اور میرے پاس تفسیر بیضاوی، ہدایہ آخرین، تفسیر جلالین، مشکوۃ جلد ثانی، فصول اکبری، اور کچھ ہلکی پھلکی اور کتابیں بھی تھیں۔ کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں بھی میرے اوپر حضرت کی بہت ہی خاص عنایات تھیں۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے یہاں زیادہ دن نہ رک سکوں گا اس لئے وہ اپنی سرپرستی میں مجھ سے سبھی کچھ پڑھوالینا چاہتے تھے۔ میں نے تو ان کی خدمت ہی میں جاکر تدریس کی ابتداء کی تھی اسلئے بسا اوقات مجھے ان کی سرپرستی کی ضرورت پڑتی تھی اور میں بلا تکلف ان سے پوچھتا اور رہنمائی حاصل کرتا تھا میں جب بھی کسی کتاب کی عبارت حل کرنے جاتا تو حضرت بتلادیتے اور میرے جانے کے بعد وہاں موجود طلباء سے کہتے کہ اس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ پھر اسی پر اکتفانہ کرتے بلکہ اس خیال سے کہ طلباء میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم نہ کرلیں بعد میں بھی حضرت مجھے یاد فرماتے اور کسی بھی کتاب کی عبارت کا مطلب طلبہ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے، کبھی میں کچھ عرض کردیتا تو غیر معمولی مسرت کا اظہار فرماتے اور کبھی میں بتلانے سے قاصر ہوتا تو خود مطلب بیان فرماتے اور مجھ سے توثیق کراتے اور یہ بھی فرماتے یہ مطلب آپ کی برکت سے سمجھ میں آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب میری عزت افزائی اور طلبہ کے ذہنوں کو میری طرف سے صاف رکھنے اور کسی غلط تاثر کے قائم نہ ہونے دینے کے لئے تھا۔ میں نے کسی ذمہ دار مدرسہ کے ایسے حالات نہ دیکھے نہ سنے تھے۔ حضرت کی عزت افزائی کا ایک واقعہ انھیں کے الفاظ میں اور لکھتا ہوں ویسے ایاز اپنی حقیقت سے واقف ہے۔ کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔

میں حضرت کے کمرے کے سامنے برآمدہ میں شرح وقایہ پڑھا رہا تھا کہ اچانک حضرت تیزی کے ساتھ کمرہ سے باہر تشریف لائے اور سب طلبہ کے سامنے میرے پڑھانے کی تعریف فرمانے لگے اور فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ اس مشکل جگہ کو آپ کیسے حل کریں گے۔ واللہ کیا تعبیر آپ نے کی ہے۔ مولانا اسے قلمبند کردیجئے۔ مولانا میرے کام آئے گا۔ اور یہ جملہ بار بار دہراتے رہے۔ میں اب بھی جب یہ باتیں لکھ رہا ہوں آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس مرد خدا کے احسانات کا نہ بدلہ ادا کرسکا ہوں نہ کرسکوں گا۔ ہاں الحمدللہ محبت و عقیدت ہمیشہ رہی اور دعا کی توفیق بھی ملتی

رہی خدا کرے ہمیشہ یہ توفیق باقی رہے ۔ مجھ حقیر کے ساتھ ان کے لطف و کرم کے ایسے واقعات بہت ہیں ۔ اپنے اساتذہ کے بعد پڑھنے پڑھانے کی زندگی کی تعمیر میں حضرت کے اس طرح کے احسانات کا بڑا دخل رہا ہے ـــــ حضرت کے لطف و کرم سب ہی اساتذہ کے ساتھ یکساں تھے لیکن اخفا کا یہ حال تھا کہ کسی کو دوسرے کے ساتھ ہونے والے احسانات کا علم کم ہی ہوتا تھا ۔ اسلئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضرت مجھ سے سب سے زیادہ محبت فرماتے ہیں ۔ مدرسہ کے اساتذہ سب ہی ہر اعتبار سے مولانا سے بہت چھوٹے تھے ۔ لیکن مولانا سب کو اپنا محترم اور مخدوم بنا کر رکھتے تھے ۔ اگر کبھی کسی استاد نے تنخواہ لینے کے لئے حضرت کے پاس جانے میں تاخیر کردی تو حضرت اسکی قیام گاہ پر لا کر تنخواہ عنایت فرماتے تھے ۔

باندہ تشریف لے جاتے تو اساتذہ سے دریافت فرماتے میں باندہ جارہا ہوں کوئی کام تو نہیں ہے اور یہ سوال اتنا مبنی بر حقیقت ہوتا تھا کہ بعض اساتذہ بتلا بھی دیتے تھے کہ یہ کام ہے اور حضرت وہ کام کرتے بھی تھے ۔ میرے ساتھ تو یہ بھی لطف و کرم بارہا ہوا کہ باندہ سے کوئی چیز لائے اور کمرہ پر آکر بہت آہستہ سے آواز دی اور فرمایا میں باندہ گیا تھا ۔ یہ چیز آپ کے لئے لے آیا ہوں ۔ ان چیزوں میں کبھی موسم کا کوئی پھل ہوتا کبھی مٹھائی ہوتی ۔ یہ معاملہ جیسا کہ ابھی عرض کیا اور اساتذہ کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا ۔ مگر مجھے تو اپنے ساتھ ہونے والے لطف و کرم کا علم ہوتا تھا ۔

مولانا کی ابتدائی طالب علمی

اپنی ابتدائی طالب علمی کا یہ واقعہ بھی حضرت نے بارہا سنایا کہ میرے استاد جو گاؤں کی مسجد میں مجھے حفظ کراتے تھے صرف ۹ پارے کے حافظ تھے ۔ جب میں نے اتنے پارے حفظ کر لئے تو فرمایا ۔ بیٹا اب تم کہیں باہر چلے جاؤ ، ہم تو صرف اتنا ہی پڑھا سکتے تھے ۔ حضرت کے والد صاحبؒ کا انتقال ہوچکا تھا ۔ والدہ مرحومہ نے کچھ کر کرا کے تھوڑا بہت انتظام کانپور جانے کا کردیا ۔ حضرت کے ساتھ کچھ خشک روٹیاں اور غالبا تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے بھی کردئے ۔ کانپور کے کسی مدرسے میں جا کر داخلہ لے لیا ۔ مدرسہ سے کھانے کا انتظام ہوا نہیں یا حضرت نے لینا پسند نہیں کیا ، یہ تفصیل مجھے یاد نہیں رہی ، بہر حال کھانا مدرسہ سے نہیں ملتا تھا ، کچھ دن تو ساتھ لائے ہوئے سامان پر گذارا کیا ۔ جب وہ ختم ہوگیا تو اللہ نے ایک وقت کے کھانے کا انتظام اس طرح

کرادیا کہ کانپور کے استاذ صاحب نے فرمایا صدیق تم ہمارے گھر سرکاری نل سے پانی بھر دیا کرو اور ایک وقت کا کھانا ہمارے یہاں سے لے لیا کرو۔ انکا گھر بالائی منزل پر تھا دو دو بالٹی لیکر زینہ پر چڑھنا پڑتا تھا، فرماتے تھے بیچ زینہ میں کھڑے ہو کر رو لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا ملتا تھا لیکن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب بننے کے لئے ابھی اور سخت تربیت اللہ کو منظور تھی۔ حضرت نے بارہا سنایا کہ ایک مہینہ بھی اس ایک وقت کے کھانے کے انتظام کو نہ ہوا تھا کہ ہمارے گاؤں کے ایک ساتھی حافظ نعمت اللہ میرے ساتھ پڑھنے کے لئے کانپور آگئے۔ اب صورت یہ تھی کہ ایک وقت کا کھانا اور دو آدمی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک ساتھی اور آگئے اور اب ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک ایک چپاتی ہی حصہ میں آتی تھی۔ یہ نئے آنے والے ساتھی تو اس آزمائش کو برداشت نہیں کر سکے اور جلد ہی وطن واپس چلے گئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ نعمت اللہ دونوں نے ایک سال پورا صرف ایک وقت کی ایک خوراک میں گذار دیا۔

مدرسہ کے قیام کا محرک

ضلع باندہ اور اس کے قرب و جوار میں کوئی قابل ذکر دینی ادارہ نہ تھا۔ اور نہ کوئی شخصیت مدت سے دینی کام کرنے والی رہی تھی۔ اسلئے اس علاقہ کا دینی حال بہت ہی خراب تھا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو صرف نام کے مسلمان تھے حقیقت اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا بلکہ بعض برادریاں تو اپنا تعارف اس طرح کراتی تھیں کہ ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان ہم تو فلاں برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد باندہ ضلع میں شدھی تحریک والوں نے ایسے کمزور مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا تھا اور ارتداد کا ایک سیلاب سا آگیا تھا۔ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسلمان یا تو واقعی مرتد ہو گئے تھے یا بالکل ارتداد کے قریب پہونچ گئے تھے۔ حضرت اس زمانہ میں فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ میں پڑھاتے تھے۔ وہاں باندہ اور اس کے اطراف کی یہ خبریں پہونچتی رہتی تھیں۔ خود سناتے تھے کہ ایک رات کو جب سونے کے ارادے سے لیٹا تو یہ خیال آگیا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہیں فرمائیں گے کہ تم نے یہ کتابیں پڑھائی تھیں کہ نہیں بلکہ مجھ سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارے علاقے میں ارتداد پھیل رہا تھا لوگ مرتد ہو رہے تھے تم نے کیا کیا؟ اس سوال کے ذہن میں آنے سے نیند غائب ہو گئی۔ ساری رات اسی فکر میں ذہن غلطاں و پیچاں رہا اور

اور ایک منٹ کو بھی نہ سو سکا تھا صبح ہونے سے پہلے ہی دل و دماغ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے علاقہ کے لوگوں میں کام کرنا ہے اور ان کے ایمان کی فکر کرنی ہے۔ پھر اسی ارادہ سے اہل مدرسہ سے اجازت لیکر اپنے یہاں چلا آیا۔ شروع میں کام کی صورت یہ تھی کہ ایسے علاقوں کے دیہات میں جہاں ارتداد کی وباء عام ہو رہی تھی حضرت نے تن تنہا دورہ شروع کر دیا اور جہاں اور جیسے دین کی بات کرنے کا موقع ملتا بات کرتے۔ میں نے ابھی کچھ دن پہلے اس دورہ کی کچھ تفصیلات دریافت کی تھیں تو فرمایا کہ جو لوگ میرے گاؤں ہتھورا سے واقف تھے وہاں جا کر تو ہتھورا کے حوالے سے تعارف کرا کر بات کرتا اور جو لوگ میری سسرال کے لوگوں سے واقف تھے ان سے، ان لوگوں کے حوالہ سے بات شروع کرتا۔ اسی طرح ایک دن میں کئی کئی دیہات گھوم پھر کر دین کی بات ان لوگوں کو پہونچایا کرتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا رات کا قیام کبھی کسی کھلیان میں، کبھی کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح کام کرتے ہوئے کئی مہینے گذر گئے تو محسوس ہوا کہ مدرسہ کی ضرورت ہے جسے اس کام کے مرکز کے طور پر استعمال کیا جائے اور ان لوگوں کے بچوں کو وہاں پڑھانے کے لئے لے جایا جائے۔ مدرسہ کی تجویز مولانا نے باندہ اور اسکے قرب و جوار کے لوگوں کے پاس جا جا کر رکھی۔ بعض حضرات سے بڑی امیدیں وابستہ کر کے ان کے پاس گئے لیکن اس کام کے نام سے ہی سب کانوں پر انگلیاں رکھ لیتے تھے۔ لوگوں نے یہ تک کہا صدیق۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم مدرسہ کی بات کرتے ہو۔ اس سلسلہ کی تفصیلات حضرت۔ بہت بتلایا کرتے تھے۔ بہت سی ابھی تک میرے حافظہ میں محفوظ ہیں مگر بات۔ بہت طویل ہو جائے گی ہر طرف سے مایوس ہو کر مولانا نے اپنے گاؤں میں مدرسہ کھول ہی دیا۔ گاؤں والے سب بے حد غریب، کچے کچے مکانات، مسجد بھی۔ بہت چھوٹی اور خستہ، مگر مولانا کے عزم مصمم کے سامنے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہ رہی۔ ان ہی دنوں حضرت نے ایک طویل نظم کہی تھی۔ جس کے کچھ اشعار حضرت نے مجھے کئی بار سنائے۔ اور جب بھی سنائے آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ خدا کرے وہ نظم کہیں محفوظ ہو۔ نظم کیا تھی ٹوٹے اور دکھی دل کی آہیں تھیں۔

مدرسہ کی تعمیر کے متعلق کچھ باتیں

حضرت کا مدرسہ اب تو ایک عظیم الشان قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ میں جب حاضر ہوا تھا اس وقت

بھی کافی عمارتیں بن چکی تھیں لیکن موجودہ عمارتوں کا شاید دسواں حصہ ہی تھیں۔ اس وقت سے بھی کئی سال پہلے یعنی اب سے تقریباً ۲۵ سال پہلے حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے مدرسہ دیکھ کر تحریر فرمایا تھا۔ اللہ اکبر! گاؤں کتنا چھوٹا اور مدرسہ کتنا بڑا اللہ کے دین کے قلعے کہاں کہاں اللہ کے بندوں نے تعمیر کردئے ہیں۔ بالکل جنگل میں منگل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ عمارتیں کیسے بنی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ میں نے سنا بھی اور خود دیکھا بھی کہ تعمیر مدرسہ کے لئے خود چھوٹا سا ایک بھٹہ لگایا جاتا تھا۔ اس میں ہر ہر مرحلہ پر خود حضرت اور اساتذہ وطلبہ کام کرتے تھے۔ پھر تعمیر کے کام میں حضرت کے ساتھ اساتذہ وطلبہ بالکل مزدوروں کی طرح لگ جاتے تھے۔ مورنگ اور سیمنٹ کے مسالے سے ہاتھوں میں زخم ہو ہوجاتے تھے۔ یہ جو قلعہ نما عمارت بنی ہے اس میں بلا مبالغہ حضرت اور حضرت کے مدرسہ کے کتنے ہی اساتذہ وطلبہ کا پسینہ ہی نہیں خون بھی شامل ہے۔ اللہ ان محنتوں اور کاوشوں کا اپنی شان عالی کے مطابق سب ہی کو اجر عطا فرمائے۔

مدرسہ کے قریب ایک نالہ ہے۔ برسات میں اسکا پانی اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنکر بڑی مقدار میں بہالاتا ہے۔ وہ کنکر خاص خاص جگہوں پر نالے کے کنارے جمع ہوجاتے ہیں۔ پتھر کی تعمیر میں چونے کے ساتھ ملا کر یہ کنکر استعمال کئے جاتے ہیں۔ حضرت اس بات سے بہت واقف تھے کہ نالے کے کس کس موڑ پر کنکر زیادہ ملتے ہیں۔ پھر ان کو جمع کرنا اور دھونا بھی خوب جانتے تھے۔ طلبہ کو لیکر خود نالے پر تشریف لے جاتے، طلبہ کے ساتھ کنکر جمع کرتے انکو ٹوکریوں میں کرکے خود دھوتے اور بیل گاڑی پر لدوا کر لاتے تھے۔ حضرت کے ساتھ کام کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ سبھی لوگ حضرت سے بے تکلف تھے۔ بلکہ بعض طلبہ تو جو پرانے ہوچکے تھے حضرت سے چھیڑ چھاڑ بھی کرلیتے تھے۔ ایسا پیارا اور محبوب مربی نہ دیکھا نہ سنا۔ لطیفے بھی ہوتے تھے۔ حضرت ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ ایسی حسین ہنسی اور اتنے خوبصورت دانت کم ہی دیکھے ہونگے۔ تعمیر کے سلسلہ میں سب لوگوں سے مشورے بھی لئے جاتے اور مشوروں کو قبول بھی فرماتے تھے۔ اس طرح تنکا تنکا کرکے یہ آشیانہ تعمیر ہوا ہے۔ اپنے مدرسہ کے علاوہ حضرت کو بستی بستی، قریہ قریہ مکاتب کے قیام کی بہت فکر رہتی تھی۔ ایسے مدرسے یا مکاتب جن کا پورا خرچ حضرت ہی کے ذمہ تھا، تقریباً سو تھے۔ اللہ جانے کتنے ہی دیہات میں، جہاں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسجد نہ بن سکی تھی، حضرت نے وہاں کے ہندو بھائیوں کو اعتماد میں لیکر مسجدیں بنوادیں۔ جہاں مسجد کی گنجائش نظر نہ آئی وہاں قبلہ رخ ایک کمرہ درسگاہ کے نام پر بنوادیا

اور اسی میں تعلیم اور نماز کا نظم فرمادیا کرتے تھے۔ حضرت کہا کرتے تھے کہ جس گاؤں میں مسجد ہے اس گاؤں کے مسلمانوں اور جس گاؤں میں مسجد نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں میں دینی اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

تواضع وانکساری

مولانا تواضع وانکساری کے پیکر تھے۔ اپنی ذات کو سب سے کمتر اور اپنے کو سب کا ادنیٰ غلام سمجھتے تھے۔ خدمت کے واقعات بہت سے پڑھے ہونگے۔ یہ بھی پڑھ لیجئے۔ مدرسہ میں مسجد کے سامنے بارہ عدد بیت الخلاء بنے ہوئے تھے۔ جو طلبہ واساتذہ سبھی کے استعمال میں رہتے تھے۔ باندہ کے دیہاتی طلبہ جس جس طرح ان کو گندہ کرسکتے تھے، کرتے تھے۔ لیکن صبح کے وقت سب بیت الخلاء روزانہ بالکل دھلے ہوئے ہوتے تھے۔ کسی کو دھونے والے کا پتہ نہ چلتا تھا ایک رات تقریباً ڈھائی بجے مجھے بیت الخلاء جانے کی ضرورت محسوس ہوئی جب میں کسی قدر قریب پہونچا تو دیکھا کہ کوئی صاحب مسجد کے وضو خانے کا پانی جس گڈھے میں جمع ہوتا تھا اس سے بالٹی میں پانی لیکر بیت الخلاء دھو رہے ہیں غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے حضرت ہی ہیں کہاں کا تقاضہ، خاموشی سے واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور حضرت کو یہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آگے بڑھ کر حضرت کے ساتھ شریک ہونیکی ہمت نہ ہوتی تھی کہ حضرت کو راز کے فاش ہوجانے پر افسوس ہوگا۔۔۔ اور حضرت کو یہ سب کرتا دیکھ کر نیند کا کیا سوال۔ اس کام سے فارغ ہوکر مسجد کے قریب کنویں پر جو نل لگا تھا وہاں جاکر غسل فرمایا اور مسجد کے صحن میں تہجد کی نماز شروع کردی۔ اللہ ہی جان سکتا ہے کہ اس کے یہاں ان کاموں کا کیا اجر ملے گا اور اس تہجد کی نماز پر اس کو کتنا پیار آتا ہوگا۔۔۔ اپنے کمرے کے سامنے صحن اور برآمدہ میں جھاڑو دے لینا تو کوئی بات ہی نہ تھی یہ تو روزمرہ کا کام تھا۔

بہت ہی معزز مہمانوں کے لئے حضرت کے کمرہ کے قریب دو بیت الخلاء بنے ہوئے تھے۔ ایک بار مدرسہ میں ایک بہت محترم بزرگ آنے والے تھے کہ اس بیت الخلاء کا ٹینک بھر گیا، مولوی محمد منظور اور مولوی انیس احمد کو جو حضرت کے قریبی لوگوں میں ہیں بلایا اور فرمایا ایک کام ہے۔ تم ہی لوگ کرسکتے ہیں، بتلاؤ کروگے۔ ان لوگوں نے عرض کیا ضرور۔ فرمایا یہ کام ہے ان نوجوانوں کو بھی شاباش ہے کہ ان لوگوں نے حضرت کے ساتھ یہ کام کیا۔ انہی دونوں کی روایت

ہے۔حضرت بھی بالٹیاں بھر بھر کر غلاظت وہاں سے لے جا کر دور کھیت میں ڈال کر آتے تھے۔

طلبہ کے ساتھ حسن سلوک

طلبہ کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح معاملہ کرتے ،انکی ہر طرح کی فکر فرماتے ،طلبہ کو کھانا تو مدرسہ سے ملتا ہی ہے، کسی غریب طالب علم کے پاس کپڑے نہ ہوتے تو اس کی فکر بھی فرماتے، دوا علاج کا بھی حتی الامکان اہتمام فرماتے تھے۔ مدرسہ کے ایک طالب علم کے چیچک نکل آئی تھی ۔حضرت سفر میں تھے۔ تین چار دن کے بعد سفر سے آئے، آتے ہی مدرسہ اور اہل مدرسہ کی خیریت دریافت کی۔ جب اس طالب علم کی چیچک کا علم ہوا تو بہت بےچین ہو گئے اور فوراً باندا واپس جانے کا ارادہ فرمالیا۔ ہم لوگوں نے ہر چند عرض کیا کہ آپ ابھی طویل سفر سے تشریف لائے ہیں، سخت گرمی کا وقت ہے کسی کو بھی اپنا خط لیکر باندہ کے کسی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیجئے۔ لیکن کسی طرح ہم لوگوں کی درخواست قبول نہیں فرمائی اور سخت دھوپ میں باندا تشریف لے گئے۔ اس وقت باندا جانے کے لئے دو کلو میٹر پیدل چل کر بس سے جانا پڑتا تھا۔ بسوں کا نظام بھی بہت اچھا نہ تھا۔ خصوصاً دوپہر میں تو بعض اوقات کافی انتظار کرنے پر بس ملتی تھی۔ اتنی دیر لو کے تھپیڑوں سے ہی واسطہ پڑتا تھا۔ حضرت مدرسہ سے تقریباً ۱۲ بجے روانہ ہوئے تھے۔ اور تین بجے باندا کے کئی ڈاکٹروں کو لیکر جو سب ہی حضرت سے نیازمندی کا تعلق رکھتے تھے، تشریف لائے۔ ڈاکٹروں نے اس طالب علم کو دیکھا اور حضرت کو اطمینان دلادیا۔ جب تک وہ طالب علم بالکل صحت یاب نہ ہو گئے تب تک حضرت انکی تیمارداری اور دوا علاج کی فکر خود فرماتے رہے ــــ ایک بار ایک پرانے شاگرد کی کسی بات پر ذکر فرمانے لگے اس شخص کا میں نے پیشاب پاخانہ دھویا ہے اور فرمایا یہ حقیقت ہے مبالغہ نہیں۔

ضلع باندہ اور اس کے قرب وجوار کے دیہات میں مسئلہ صرف علم اور دینداری کے نہ ہونے کا نہیں تھا بلکہ اسلام کی بقاء اور عدم بقاء کا مسئلہ تھا اور مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ اتنا ہی اہم تھا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے مولانا ان دیہات کے طلبہ کی بہت رعایت کرتے تھے۔ یہ طلبہ اگر مدرسہ میں پڑے رہیں خواہ پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں تب بھی مولانا کو انکا قیام منظور تھا۔ میں اپنی کوتاہ نظری سے کبھی کبھی ایسے نہ پڑھنے والے طلبہ کے بارے میں حضرت سے کچھ نامناسب گفتگو بھی کرلیا کرتا تھا۔ ایک طالب علم لال محمد تھا بالکل پڑھتا نہ تھا۔ کئی بار حضرت

سے عرض کیا اسکو اسکے گھر بھیج دیجئے۔ حضرت ٹال دیتے۔ ایک دن فرمانے لگے لوگ کہتے تھے لال محمد نہیں پڑھ پائیگا، دیکھئے اسکا قرآن مجید ناظرہ ختم ہو گیا۔ میں سمجھ گیا مخاطب میں ہی ہوں۔ میں نے عرض کیا اس نے پانچ سال میں صرف ناظرہ قرآن ختم کیا ہے، میرے نزدیک مدرسہ کی رقم کسی طالب علم پر صرف ناظرہ کے لئے پانچ سال تک خرچ کرنا جائز نہیں ۔۔۔ حضرت کا جملہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ کسی قدر شان جلال کے ساتھ فرمایا، مولانا اپنے گاؤں میں اسلام کو سمجھنے والا صرف لال محمد ہو گا۔ اس علاقہ کے لوگ یہاں پڑھے رہیں خواہ ایک لفظ نہ پڑھیں تب بھی سمجھے کو ملا ہے۔۔۔ میں سچ عرض کرتا ہوں بالکل ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اس جملہ سے وہ سامنے سے ہٹ گیا۔ مجھے اپنی وہ کیفیت بھی ابھی تک یاد ہے۔ بہت دیر تک اپنی کوتاہ بینی اور حضرت کی نگاہ کی دوررسی کو سوچتا رہا۔ اس اللہ کے بندہ کی نگاہ ہر وقت کہاں کہاں رہتی ہے ہم لوگ تو غور و فکر کے بعد بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتے۔

مہمانوں کا اکرام

احادیث میں اکرام ضیف کو ایمان کی علامت بتلایا گیا ہے، حضرت کے یہاں اسکا اہتمام آخری حد تک تھا۔ مہمانوں کی آمد تو وقت بے وقت ہوتی ہی رہتی تھی۔ مولانا مہمانوں کو مدرسہ کے ذمہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ اب اس کی صورت یہی تھی کہ اپنے گھر جو کچھ ہو یا ہو سکے وہ لے آئیں اور بعض بہت ہی قریبی عزیزوں کے گھروں سے کچھ لے آئیں۔ مولانا کا کمرہ جو دار الضیافہ بھی تھا۔ اس میں ایک عدد المونیم کی سینی، چار المونیم کے پیالے اور ایک کپڑا جس میں مختلف رنگوں کے کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے، رکھا رہتا تھا۔ اگر بے وقت مہمان آتے تو حضرت خود یہ مذکورہ سامان اٹھاتے اور چل دیتے اپنے گھر اور عزیزوں کے گھروں سے کھانا لانے کے لئے۔ جس جس کا گھر راستہ میں پڑتا جاتا آواز دیتے جاتے اور ایک پیالہ پکڑاتے جاتے صاحب خانہ اپنے گھر سے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا مدرسہ لیکر پہنچ جاتے، پھر حضرت اپنے گھر جا کر جو کچھ ملتا یا جلد انتظام ہو سکتا، لے آتے ۔۔۔ میں الحمد للہ مولانا کے کسی حد تک قریب تھا۔ کبھی کبھی یہ کام میں نے بھی کیا ہے مگر بہت کم! گاؤں کے لوگوں کا میرے ساتھ بھی بہت محبت کا تعلق تھا۔ ایک دفعہ حضرت کی عدم موجودگی میں بے وقت مہمان آگئے، ایک بہت ہی قریبی دوست کے گھر جا کر میں نے بھی آواز لگادی وہ گھر پر نہ تھے، بچوں کے ذریعہ اپنی بات اندر تک پہنچادی کہ مہمان آگئے ہیں، ایک پیالہ

سالن یا دال دیدیں، اللہ انکی اہلیہ کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ انھوں نے بچے کے ذریعہ پوری پتیلی باہر بھیج دی کہ مہمانوں کو کھلادیں جو بچ جائے واپس کر دیں، ابھی بچوں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔اس گاؤں کے لوگ مہمان نوازی میں بے مثال تھے۔ حضرت گاؤں کے لوگوں کے احسانات کا جو مدرسہ کے ابتدائی زمانہ میں ان لوگوں نے کئے تھے۔۔بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔
جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ میں حضرت کی اس سنت پر کبھی کبھی عمل کرلیا کرتا تھا۔ لیکن حضرت کو یہ بات برداشت نہ تھی کہ میں کسی کے دروازے پر جاکر اس طرح آواز لگاؤں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت کی کچھ طبیعت خراب تھی، گھر تشریف لے گئے تھے کہ بے وقت مہمان آگئے۔ میں نے یہ سوچا کہ حضرت کو زحمت ہوگی، خود ہی کچھ انتظام کرلیا جائے۔ وہی سینی اور کٹورے لیکر چلدیا۔ کسی ذریعہ سے مہمانوں کا حضرت کو علم ہوگیا، فوراً چلے آئے، ادھر میں مدرسہ سے نکل چکا تھا۔راستہ میں ملاقات ہوگئی، حضرت کی آنکھوں سے آنسو بہ پڑے اور فرمایا، مولانا سب کام آپ سے کرالیتا ہوں یہ کام آپ سے نہیں کراؤنگا۔ پھر بڑے درد سے فرمایا یہ تو میرے نصیب ہی میں لکھا ہے۔

اصلاح بین الناس کی فکر

اللہ کے بندوں میں باہمی محبت والفت اور اچھے تعلقات کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے اور اس کے بالمقابل آپس کی لڑائی اور باہمی نزاع کو شریعت میں بہت ناپسند کیا گیا ہے۔ حضرت کو اصلاح بین الناس کی بڑی فکر رہتی تھی، خصوصاً وہ لوگ جو دیندار کہے جاتے ہیں یا کسی دینی جماعت یا ادارہ سے وابستہ ہیں جن کا اختلاف نہ صرف دو شخصیتوں یا دو گروہوں کا اختلاف ہوتا ہے بلکہ اس کے نتائج بڑے دور رس اور دین کے لئے بڑے مضر ہوسکتے ہیں۔ایسے لوگوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے حضرت بڑے کوششیں فرماتے اور جو کچھ بن پڑتا اس سے گریز نہ کرتے۔ایک مدرسہ کے دو استاذوں میں کچھ اختلاف ہوگیا اور بات کچھ حد سے متجاوز ہوگئی، حضرت نے ان دونوں کے درمیان صلح کرانی چاہی۔ان میں سے ایک تو راضی ہوگئے لیکن دوسرے جن پر کچھ زیادتی ہوگئی تھی کسی طرح راضی ہونے اور دوسرے کے معافی مانگنے پر بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضرت نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی۔میں اور ایک صاحب اور وہاں موجود تھے۔ جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو حضرت نے اپنی ٹوپی اتاری اور انکے قدموں پر،

ذلالت، ہم لوگوں پر تو جیسے بجلی گر گئی اور مجلس میں ایک سکتہ سا سب کو ہو گیا۔ لیکن حضرت کے اس عمل نے اپنا کام کر دیا اور آخر ان کا دل بھی نرم پڑ گیا اور انہوں نے بھی حضرت کے ارشاد کے مطابق مصالحت کر لی۔

اسی طرح کا واقعہ کلکتہ کے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح و صفائی کرانے کے سلسلے میں بھی پیش آیا اور جب پھر پرجوش نوجوانوں کو مصالحت کے لئے حضرت کسی طرح تیار نہ کر سکے تو آخر میں روتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار کر ان کی قدموں میں ڈالدی اور نتیجہ یہاں بھی اچھا ہی رہا اور الحمد للہ ایک خطرناک قسم کا خون خرابہ ٹل گیا۔ اس قسم کے واقعات حضرت کی زندگی میں بار بار پیش آئے ہیں اور ان کی کوششوں نے کتنے ہی مسلمان خاندانوں اور دینی اداروں کو ہلاکت و بربادی سے بچالیا۔ میری نگاہوں نے "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کا مصداق حضرت سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔

آخری سفر جو سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا اس سے چند دن پہلے بھی حضرت اس حال میں کہ ٹانگ کے درد کی وجہ سے قدم زمین پر رکھنا مشکل تھا ایک مدرسہ میں پیدا شدہ باہمی نزاع کو دور کرنے کے لئے باندا سے سیکڑوں میل کا سفر کر کے ایک جگہ تشریف لے گئے تھے اور واپسی میں کلکتہ تشریف لائے تھے۔ میرے عرض کرنے پر کہ اس حال میں بھی آپ سفر سے باز نہیں آرہے ہیں فرمایا کہ بہت مجبوری میں یہ سفر کیا ہے اور بہت ضرورت اس کی تھی۔ اور یہ مذکورہ بالا بات بتلائی اور فرمایا الحمد للہ سفر مفید رہا۔ اہل مدرسہ اختلافات ختم کرنے پر راضی ہو گئے۔

مولانا کا بچپن کیسے گذرا

مولانا کی زندگی از اول تا آخر مجاہدانہ زندگی ہے۔ پوری زندگی میں آرام و راحت اور سکون و اطمینان کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔ شاید ہی کسی بڑے عالم دین کی زندگی ایسی رہی ہو۔ حضرت اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے، گاؤں میں اتنی غربت تھی کہ عام طور پر بچوں کو صبح ہی بکریوں کے طرح جنگل کو نکال دیا جاتا تھا۔ بچے صبح سے شام تک جنگل میں رہتے جس زمانہ میں کولریا اس جیسی چیزیں ملتیں ان سے پیٹ بھر لیتے، جنگلی بیروں کے زمانہ میں دن بھر وہی کھاتے پھرتے، جب چنے کا ساگ کھانے قابل ہوتا تو وہی پیٹ بھرنے کا ذریعہ ہوتا اور شام کو گھر چلے آتے، دوسرے دن بھی یہی ہوتا۔ اس کے بعد فرماتے تھے کہ چونکہ میں حفظ

کرتا تھا اس لئے مجھے روٹی ملتی تھی۔ میری دو چھوٹی چھوٹی بہنیں تھیں ان کو بھی عام بچوں کے ساتھ صبح ہی گاؤں سے باہر بھیج دیا جاتا۔ میں اس پر روتا تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنی روٹی میں ان کو شریک کرلونگا لیکن میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ واقعہ جب بھی حضرت نے سنایا ہمیشہ آبدیدہ ہوجاتے اور آواز گلے میں پھنس جاتی تھی۔ یہ دونوں بہنیں کم عمری ہی میں انتقال کرگئی تھیں۔

ایثار و قربانی کے چند نمونے

حضرت مولانا کے گھر میں کھانے کا حال بہت ہی سادہ تھا۔ عام طور پر سب ہی لوگ چٹنی روٹی یا چٹنی چاول ہی کھاتے یا اسی درجہ کا کوئی اور کھانا دلیہ یا مہیر پک جایا کرتا تھا۔ مہیر بندیل کھنڈ کا ایک خاص دیہاتی کھانا ہے، چاول کو چھاچھ یعنی مٹھا میں پکایا جاتا ہے۔ گاؤں میں بہت ہی کم گھر ایسے تھے جن میں دونوں وقت دال روٹی چلتی ہو۔ حضرت کے لئے بھی گھر سے موٹی موٹی دو روٹی اور ان پر خشک چٹنی رکھی ہوئی چلی آتی تھی۔ اللہ جنت میں جنت کی اعلی سے اعلی نعمتیں کھلائے۔ اس بندہ خدا کو چٹنی پسند بھی بہت تھی۔ میں جب شروع میں حاضر ہوا تو چند دن دونوں وقت حضرت کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ بعد میں پتہ چلا یہ دال اور سبزی کا تو میرے لئے اہتمام ہوتا ہے۔ مجھے تو حضرت رومال میں سے گیہوں کی چپاتی نکال کر دیتے اور خود اسی رومال میں سے لقمہ توڑ توڑ کر ہی نکال کر کھاتے تھے۔ کئی وقت کے بعد یہ بھی پتہ چلا کہ یہ صورت اس لئے اختیار فرمائی جارہی ہے کہ حضرت جوار کی روٹی کھا رہے ہیں اور گیہوں کی چپاتی کا اہتمام بھی صرف اس احقر کے لئے ہے۔ کھانے کا یہ ساتھ حضرت کے غیر معمولی مشاغل کی وجہ سے زیادہ دن نہ رہ سکا۔ انکا نہ کوئی وقت متعین نہ کھانا کھانا ہی طے تھا۔ اس وقت بھی مشاغل کا یہ حال تھا کہ دوپہر کا کھانا شام تک رکھا رہتا اور کھانے کی نوبت نہ آتی اور شام کو یونہی واپس چلا جاتا بعد میں تو کھانا بس ایک ہی وقت کھاتے تھے۔ ناشتہ بھی غائب اور شام کو کھانا بھی بند۔ میں اس خانوادہ کی کیا کیا بات یاد کروں ہر ہر بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ جب میں نے الگ کھانا شروع کر دیا تو مطبخ سے بہت ہی سادہ سی دال روٹی آجایا کرتی تھی اور اکثر ہی بلکہ تقریباً روز ہی حضرت کے گھر سے ایک پیالہ میں یا چھوٹی سی المونیم کی پتیلی میں کبھی سبزی، کبھی دال آجاتی تھی۔ اس وقت تک مجھے حضرت کے گھر کے کھانے کا حال معلوم نہ تھا۔ تھوڑا آئے ہوئے شاید چند ہفتے ہی گذرے تھے ایک دن میں کھانا کھانے کے لئے اپنے کمرہ میں بیٹھ چکا تھا کہ مولانا کی ایک بچی جسکی عمر اس

وقت تقریباً چھ سات سال ہوگی میرے لئے سبزی لیکر آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم کھانا کھالو۔ اس نے کہا میں کھانا کھا چکی ہوں۔ میں نے بس یونہی مزید سوال کرلیا کہ کیا کیا کھایا۔ اس نے کہا کہ چٹنی چاول۔ میں نے پوچھا یہ سبزی کیوں نہ کھائی۔ بھولی بھالی بچی نے گھر کی حقیقت صاف صاف بیان کردی کہ یہ تو صرف آپ کے لئے پکتی ہے۔ یہ سننا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اس سے کہا تم یہ واپس لے جاؤ اس نے کچھ تکلف کیا۔ لیکن میرے اصرار پر واپس لے گئی۔ کچھ دیر کے بعد پھر لے آئی لیکن میں نے کسی بچہ کے ہاتھ دوبارہ واپس کردی اور بعد میں، میں نے حضرت سے اس کی شکایت کی کہ میرے بھوٹے بھوٹے بھائی بہن تو چٹنی کھائیں اور میرے لئے اہتمام سے سبزی یا اچھی سی دال بنا کر بھیجی جائے۔ مجھے آپ اتنا بے حمیت اور خود غرض نہ سمجھیں، حضرت نے اس واقعہ کو بالکل ہی اہمیت نہ دی اور فرماتے رہے، پتہ نہیں بچی نے آپ سے کیا کہدیا اور آپ اتنے متاثر ہو گئے۔ ارے بچے گھروں میں سب کچھ کھاتے رہتے ہیں، آخر میں، میں نے ہی ہار مان لی اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔

اس طرح کے واقعات حضرت کے یہاں کے روزمرہ کے واقعات تھے، خیر حضرت تو حضرت تھے۔ لیکن این خانہ ہمہ آفتاب بود اس معاملہ میں حضرت کی اہلیہ مرحومہ کا کردار مجھے حضرت سے بھی بلند معلوم ہوتا ہے۔ وہ عورت ذات ایک مالدار بلکہ زمیندار خاندان کی پروردہ اپنی ذات پر ہی نہیں اپنی بھوٹی بھوٹی اولاد کے مقابلہ میں غیروں کو اس طرح ترجیح دیتی تھیں۔ اللہ نے کیسا دل گردہ اس بندئ خدا کو عطا فرمایا تھا۔ الٰہی اس جنتی جوڑے کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عنایت فرمائیے، اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کے ساتھ جو ان حضرات نے احسان اور لطف و کرم کا معاملہ کیا ہے اس کا اپنی شان عالی کے مطابق اجر عطا فرمائیے۔

میرے حافظہ میں اس طرح کے نہ جانے کتنے ہی واقعات پڑے ہیں۔ ایک واقعہ اور لکھتا ہوں۔ حضرت کی بڑی صاحبزادی کی شادی کو کچھ ہی دن گزرے تھے، ان کی سسرال کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ غالباً ان کو سسرال لے جانا تھا۔ ان حضرات کا قیام دو تین دن ہتھورا میں رہا، ان لوگوں کی کئی کئی رشتہ داریاں اس گاؤں میں تھیں۔ ایک دن ان لوگوں کا رات کا کھانا مولانا کے ایک قریبی عزیز کے یہاں تھا، عصر کے بعد ذرا اچھی سی بارش ہوگئی اور گاؤں کے راستے خراب ہو گئے۔ جن صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ انھوں نے حضرت کے گھر کھانا بھجوادیا اور کہلادیا کہ مہمان ہمارے یہاں تشریف نہ لائیں اس میں زحمت ہوگی۔ اللہ کا کرنا کہ مغرب کے کچھ دیر بعد کانپور کے کئی مہمان اچانک مدرسہ میں پہنچے، حضرت کو انکے کھانے کی فکر ہوئی۔ گھر جا کر کانپور

کے ان مہمانوں کا ذکر کیا اور معلوم کیا کہ کھانے کو کچھ ہے۔ اہل خانہ نے پوری بات بتلادی اور یہ بھی کہ ہم لوگوں کی دعوت بھی چونکہ وہاں تھی اس لئے ہمارے لئے بھی کھانا وہیں سے آیا ہے گھر کچھ نہیں پکا ہے۔ حضرت نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ یہ کھانا مدرسہ بھیج دو اور تم لوگ کچھ دلیہ یا چاول وغیرہ پکالو۔ وہاں سے جو بچ جائیگا آجائیگا۔ اور یہی ہوا گھر سے وہ کھانا آگیا۔ کانپور کے مہمانوں نے کھایا اور جو بچا وہ اپنے مہمانوں کو کھلادیا۔ اپنے سمدھیانہ کے مہمانوں کے مقابلہ میں مدرسہ کے مہمانوں کو ترجیح دینا بڑا مشکل کام ہے۔

ایک دفعہ حضرت کو کانپور تشریف لیجانا تھا۔ حضرت مفتی محمود صاحب کانپو تشریف لانے والے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جلد جلد اسباق سے فارغ ہوئے اور مدرسہ سے متعلق بہت سے کام انجام دیئے۔ میں نے جلدی سے گھر سے کھانا منگوالیا۔ کھانا وہی دو روٹی اور چٹنی۔ حضرت سے کھانے کے لئے عرض کیا، حضرت نے کسی قدر جھلاہٹ کے ساتھ فرمایا آپ کو کھانے کی پڑی ہے مجھے بہت عجلت ہے۔ میں نے پھر عرض کیا، حضرت نے پھر انکار کردیا۔ لیکن میں نے ذرا اصرار اور لجاجت کے ساتھ اپنی درخواست عرض کی تو ایک روٹی کھالی اور کانپور چلے گئے۔ چوتھے دن دوپہر میں میرے نام حضرت کا ایک پرچہ نومیل سے آیا (نومیل حضرت کے مدرسہ سے ڈیڑھ میل دور سڑک پر ایک جگہ ہے جو باندا سے نومیل پر ہے، وہاں کوئی آبادی نہیں ہے اسی لئے اس جگہ کا نام ہی نومیل پڑ گیا ہے، آنے والی بسیں ہتھورا کی سواریوں کو وہیں اتار دیتی ہیں اور باندا جانے کے لئے وہیں سے مسافر سوار ہوتے ہیں) اس پرچہ میں لکھا تھا، میرا کھانا اور ایک لوٹے میں پانی لیکر کسی طالب علم کو بھیج دیجئے اور دو تین سائیکلوں کا انتظام کر کے بھجوادیجئے، میں مدرسہ کی دہل لایا ہوں۔ میں نے کھانا اور پانی تو فوراً دو لڑکوں کے ہاتھ سائیکل سے بھیج دیا اور یہ کہلادیا کہ مزید سائیکلیں ابھی بھیج رہا ہوں اور ان دونوں طالب علموں سے کہا کہ جب حضرت کھانا کھالیں تو تم میں سے ایک دہل کی نگرانی کے لئے وہیں رک جائے اور دوسرا حضرت کو سائیکل پر بٹھا کر لے آئے۔ ان لوگوں نے یہی کیا۔ حضرت تشریف لے آئے اور آتے ہی سلام کے بعد مجھ سے فرمایا کشف ہو گیا تھا کیا؟ میں کچھ نہ سمجھ سکا تو دوبارہ فرمایا کشف ہو گیا تھا کیا؟۔ میں نے عرض کیا حضرت میں سمجھا نہیں اس پر فرمایا کہ آپ نے جو ایک روٹی اصرار کر کے کھلادی تھی وہی کھائی تھی یا اب آپ کا بھیجا ہوا کھانا کھا کر آرہا ہوں۔ میں نے عرض کیا حضرت کانپور میں کسی نے آپ کو کھانا نہیں کھلایا۔ فرمایا کسی نے بھی نہیں کھلایا ____ حضرت سے کھانے کے لئے اصرار کرنے کی ہمت کم ہی لوگوں کو ہوتی تھی، ورنہ اہل کانپور [illegible] تے تھے۔

اپنے لئے احتیاط ہی پسند تھی

مولانا کے یہاں اساتذہ کی تنخواہیں تو واقعی کم تھیں لیکن اور بہت سی سہولتیں ایسی تھیں جن سے تنخواہوں کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی۔ مثلاً اساتذہ کو مکانات بہت ہی کم کرایہ پر دیئے جاتے تھے۔ اور حتی الوسع ہر خواہش مند استاذ کو مولانا مکان فراہم کر دیتے تھے۔ اسی طرح مطبخ کے لئے جو غلہ تیل وغیرہ فصل کے موقع پر خریدتے تھے۔ اس میں اساتذہ کے گھروں کے خرچ کا بھی لحاظ کر کے خریدتے تھے۔ اور فصل کے موقع پر جس نرخ سے غلہ خریدا گیا تھا اسی نرخ سے سال بھر اساتذہ کو دیتے رہتے تھے۔ یہ سامان قرض بھی دیدیا جاتا تھا اور قیمت قسط وار تنخواہ سے کٹتی رہتی تھی۔ رمضان المبارک سے پہلے شعبان میں رمضان کے خرچ کے لئے چاول، دالیں اور تیل وغیرہ مطبخ کے بند ہونے سے پہلے ہی دیدیا جاتا تھا۔ جس سال مولوی حبیب صاحب (حضرت کے بڑے صاحبزادہ) مدرس ہوئے ہیں اس سال شعبان کا واقعہ ہے کہ مطبخ کے ذمہ دار عام اساتذہ کو یہ سامان دے رہے تھے۔ مولوی حبیب صاحب اتفاقاً ادھر سے گذرے (اس وقت مطبخ اتنا اندر نہ تھا) تو انھوں نے مولوی حبیب صاحب سے کہا آپ کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیں، آپ بھی تو اب استاذ ہو گئے ہیں مولوی حبیب صاحب نے انکے کہنے پر ۲ یا ۳ کلو چنے کی دال قیمتاً لے لی۔ وہ دال لیکر نکل رہے تھے اور ادھر سے حضرت تشریف لے آئے، دریافت فرمایا کیا ہے۔ آواز میں کرختگی تھی، بیچارے مولوی صاحب تو گھبرا گئے غالباً مطبخ کے ذمہ دار نے انکی طرف سے عرض کیا ۲ کلو دال نقد قیمت دے کر لی ہے۔ میں نے حضرت کے غضب کا ایسا حال کبھی نہ دیکھا تھا، انتہائی سخت آواز میں مولوی حبیب احمد کو ڈانٹا اور فرمایا، تمہارے باپ کا مال ہے، میں بھیک مانگ کر تمہارے لئے لاتا ہوں۔ میں فوراً پہونچ گیا اور عرض کیا وہ بھی تو مدرس ہیں اور یہ سہولت تو سبھی مدرسین کے لئے ہے لیکن حضرت کا غضب کسی طرح کم نہ ہوا، ہم سبھی لرز گئے۔ بیچارے مولوی حبیب احمد صاحب کا تو برا حال تھا۔ کسی طرح مطبخ واپس گئے اور وہ دال واپس کی۔

اپنے اور اپنے اہل خانہ کے بارے میں حضرت کی احتیاط کا یہی حال تھا۔ مدرسہ سے نہ کبھی تنخواہ لی اور نہ کوئی اور سہولت اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے مدرسہ سے حاصل کی۔ جس زمین میں مدرسہ بنا ہوا ہے اسکا اکثر حصہ مولانا کے اہل خاندان یا اعزہ کی ملکیت تھا نیز جس کمرہ میں حضرت

کا قیام تھا وہ بھی حضرت ہی نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ مدرسہ کی رقم اس میں صرف نہ کی تھی۔ مدرسہ کے کاموں سے سفر کرنا ہوتا تھا تب بھی حتی الوسع مدرسہ سے کرایہ نہ لیتے اور سفر میں کوئی معمولی سی تجارت کر لیتے، جس سے کرایہ نکل آتا۔ مدرسہ کے ایک استاد مولانا سعد اللہ صاحب کی کرانہ کی دوکان تھی۔ کانپور تشریف لے جا رہے تھے، فرمانے لگے مولوی سعد اللہ صاحب بتلائیے آپ کی دوکان کے لئے کانپور سے کیا لیتے آئیں جس سے ہمارا کرایہ نکل آئے، مولانا سعد اللہ صاحب نے عرض کیا حضرت سن لائٹ صابن ہمیں باندا میں اس قیمت کا ملتا ہے کانپور میں آپ کو اس سے کم قیمت پر مل جائیگا۔ آپ ایک پیٹی صابن لے آئیں، ہم لے لیں گے۔ آپ کا کرایہ نکل آئیگا۔ مولانا کانپور سے واپسی میں ایک پیٹی سن لائٹ صابن لے آئے اور مولانا سعد اللہ صاحب کو دیدیا، اس میں صابن کی قیمت اور مولانا کا کرایہ بھی نکل آیا اور کچھ عدد سن لائٹ صابن بچ رہے۔ فرمایا یہ غریب طلباء کے کام آجائیں گے۔

زندگی مسلسل سفر تھی

حضرت کے اسفار کا حال تو عام طور پر لوگوں کے علم میں ہے ہی، یہ سفر پیدل، سائیکل، بیل گاڑی، موٹر سائیکل، ٹرک، بس اور ٹرین سے ہر طرح فرماتے تھے۔ کاموں کے ہجوم کی وجہ سے کہیں قیام نہیں فرماتے تھے۔ اول سفر اور آخر سفر پھر جن حضرات کی دعوت پر سفر فرماتے تھے ان میں بعض تو بہت ہی خود غرض ہوتے تھے انکا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حضرت تشریف لے آئیں خواہ حضرت پر کچھ بھی گذر جائے اور اللہ کے بندے کسی راحت رسانی کا اہتمام بھی نہیں کرتے تھے۔ مجھے بھی حضرت کے ساتھ بارہا ایسے سفر کرنے پڑے ہیں۔ لیکن ساری مصیبتوں اور اسفار کی صعوبتوں کے باوجود کبھی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ بہت سے اللہ کے بندے تو واپسی کرایہ تک نہ دیتے تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ لوگ دور دراز دیہات میں لے گئے اور واپسی کا کوئی نظم نہیں کیا۔ حضرت کو خود نظم کر کے واپس آنا پڑا۔ جب تک جان میں جان رہی کسی کی دل شکنی نہیں کی خواہ کچھ بھی گذر جائے۔ جو باتوفیق بندے کرایہ پیش بھی کرتے تو ہوتا تو حضرت انکار فرماتے اور اگر وہ اصرار کرتے تو صرف بقدر ضرورت ہی کرایہ لیتے۔ ایک صاحب نے جن کے یہاں حضرت تشریف لے گئے تھے میرے ذریعہ حضرت کی خدمت میں فرسٹ کلاس کے کرایہ کے حساب سے رقم پیش کی۔ حضرت نے فرمایا یہ رقم تو بہت زیادہ ہے

انھوں نے کہا کہ میں اپنی ذاتی رقم میں سے یہ پیش کر رہا ہوں مدرسہ کے پیسے نہیں ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ فرسٹ کلاس سے تشریف لے جائیں۔ یہ سن کر فرمانے لگے مسلمانوں کے پیسے اس کام کے لئے ہیں؟ میں ساری رات اسٹیشن پڑا رہونگا لیکن فرسٹ کلاس سے نہ جاؤنگا۔

مولانا کے اسفار میں سے بعض اسفار ایسے ہوتے تھے جو ہم لوگوں کی نظر میں بالکل غیر ضروری ہوتے تھے۔ لیکن حضرت کی دوررس نگاہ میں اس کے بہت سے دینی فائدے ہوتے تھے۔ ایک بار دوپہر کو اسباق سے فارغ ہوکر سائیکل کے ڈنڈے پر سوار ہوکر ایک جگہ جارہے تھے، میں نے مقصد سفر معلوم کیا تو کافی کریدنے کے بعد بتلایا فلاں گاؤں میں ایک بچے کی ختنہ ہے، مجھے واقعی حضرت کا یہ سفر بہت ناگوار ہوا میں نے عرض بھی کردیا کہ یہ بھی کوئی وجہ سفر ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا "مولانا، انکی بگھی مٹی میں شریک ہو کر میں نے انکو دین کی بات پہنچائی ہے" یہ مولانا ہی کے الفاظ تھے ——— کافی دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ اس طرح کی تقریبات میں شرکت کرنے سے دین کے کام کے لئے کیسے راستے ہموار کئے ہیں۔

خدمت خلق

حدیث شریف میں خدمت خلق کی بڑی عظمت بیان فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ کی مخلوق، اللہ کا کنبہ ہے۔ جو لوگ مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔ وہ اللہ کو بہت محبوب ہوتے ہیں۔ خدمت خلق کے معاملے میں بھی حضرت اپنی مثال آپ تھے۔ کسی کی کسی طرح کی بھی ضرورت ہو، خواہ بچوں کی شادی بیاہ یا مریضوں کے علاج معالجہ کا مسئلہ یا کسی کو ملازمت دلوانا اور اس سلسلہ میں کوشش کرنا۔ حضرت سے وہ عرض کردے یا کسی طرح حضرت کے علم میں آجائے۔ اب بس حضرت پر گویا واجب ہوگیا کہ اس کی جو مدد بھی کرسکتے ہوں کریں، کتنے ہی مریضوں کے ساتھ بمبئی، کانپور، لکھنؤ، باندا شہر اور اللہ جانے کہاں کہاں کے سفر کرتے تھے اور اس میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی مدد فرماتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد جن کی ملازمتوں کے لئے حضرت نے کوشش کی سیکڑوں نہیں ہزاروں ہوگی۔ شادی کرانے کا تو ہمارے حضرت نے ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ کتنے ہی لوگ ہونگے جنکے گھر حضرت نے بسائے ہونگے اور وہ اس سلسلہ میں حضرت کے مرہون منت ہونگے

•

وقت کی قیمت کا احساس

دنیا میں ہر چیز کا بدل مل سکتا ہے لیکن وقت ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ ضائع ہو جائے تو اسکی تلافی ناممکن ہے۔ اور ہم لوگوں میں سب سے زیادہ ناقدری کا شکار ہمارے اوقات ہی ہیں۔

مولانا کے نزدیک اپنے وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی وہ جن کاموں میں اپنے اوقات کو صرف کرتے تھے ان کو دین سمجھ کر ہی اپنا وقت لگاتے تھے۔ مدرسہ میں بڑی بڑی اور مشکل کتابوں کے پڑھانے کے ساتھ ساتھ تعمیرات کا انتظام بلکہ عملاً اس کے کاموں میں شرکت، مدرسہ مطبخ کی فکر اور اس کے لئے بھی وقت خرچ کرنا مہمانوں کی میزبانی بلکہ ان کے لئے ہر طرح اکرام اور راحت رسانی کی فکر۔ اور روزانہ ہزاروں نہ سہی سیکڑوں کے اوسط سے تو یقیناً تعویذوں کا لکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ اپنے معمولات سفر و حضر میں بھی نہ چھوڑتے تھے۔ بلکہ سفر میں تو تلاوت کا زیادہ ہی اہتمام فرماتے تھے۔

میں ایک بار بمبئی کے سفر میں ساتھ تھا، لکھنؤ سے یہ سفر ہوا تھا۔ کانپور میں بھی کچھ حضرات ملنے کے لئے آئے پھر جھانسی پہنچ کر بھی کچھ لوگوں نے ملاقات کی۔ ضرورت مندوں کو بھی حضرت کا پروگرام معلوم رہتا تھا۔ جھانسی سے رات کے دو بجے کے قریب گاڑی چلی تھی۔ مجھے تو دوبارہ نیند آگئی لیکن حضرت اسی وقت سے تہجد میں مشغول ہو گئے۔ ۲ بجے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نماز سے فراغت کے بعد دعا و مناجات میں مشغول رہیں۔ بمبئی کا یہ سفر بمبئی پہنچنے کے بعد مشغول کرنا تک تھا۔ بمشکل [illegible] سفر کے [illegible] لکھنے لگا اور ایک دو بار حضرت کو بھی متوجہ کیا۔ حضرت ایک لمحہ کے لئے توجہ فرماتے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ [illegible] حضرت [illegible] اور اپنے کام یعنی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

ان کا بھی انتقال سمندر میں ہوا، اور وہ سمندر کے سپرد ہوا، اور انکی لاش [illegible] اور تواضع کے باوجود [illegible] استغنا۔ اور دینی تصلب حضرت شاہ وصی اللہ صاحب [illegible] مولانا نے [illegible]

کشف وکرامات کوئی زیادہ کمال کی چیزیں نہیں ہیں

اللہ جانے لوگوں نے حضرت کی کیا کیا کرامات گڑھ رکھی ہیں۔ ہم لوگوں نے تو اس بندہ خدا کی مجاہدانہ زندگی، اتباع سنت اور بے مثال اخلاص و ایثار کے سوا کوئی معروف قسم کی کرامت نہیں دیکھی بلکہ بعض سنی سنائی کرامتوں کی حضرت سے تصدیق کی تو حضرت نے نفی ہی فرمائی ــــ ابھی کچھ ہی دن پہلے ایک دن فرمانے لگے یہ کشف و کرامات کوئی مشکل کام نہیں، ذرا سی ریاضت اور لوگوں سے اجتناب اور عزلت نشینی سے یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں اور فرمایا جس زمانہ میں، میں پانی پت میں پڑھتا تھا تو اکثر وقت اپنے کمرے میں گذارتا اور لوگوں کے اختلاط سے بہت پرہیز کرتا تھا۔ اسوقت مجھے بہت صحیح کشف ہونے لگا تھا اور اپنے کشف کا ایک واقعہ بھی سنایا، فرمایا کہ ایک بہت ہی معتمد سرحدی نوجوان کے متعلق مجھے یہ کشف ہوا کہ اسکو کل پولیس پکڑ کرلے جائیگی، میں نے اس نوجوان سے تنہائی میں اسکاذکر کیا۔ اس نے مجھ سے کہا کیا آپ مجھ سے واقف ہیں، میں نے کہا کہ بس اتنا ہی کہ آپ اس مدرسہ کے طالب علم ہیں تو اس نے اپنا قصہ سنایا کہ میں نے اپنے علاقہ میں انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور جب خطرہ محسوس ہوا تو مخفی طور پر یہاں آکر طالب علمی کرلی ہے۔ مجھے یہ بتلا کر یہ طالب علم اسی وقت مدرسہ سے غائب ہو گیا۔ دوسرے دن انگریز پولیس نے پورا مدرسہ گھیر لیا اور ایک ایک کونہ کی تلاشی لے ڈالی۔ انکا افسر بار بار یہی کہتا تھا کہ ہمارے محکمہ خفیہ کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ طالب علم کل تک یہیں تھا۔ اہل مدرسہ نے جو حقیقت حال سے ناواقف تھے پوری سچائی سے بتلادیا کہ ہاں اس شکل کا طالب علم کل تک تو یہاں تھا مگر اب یہاں نہیں ہے اور اس سے زیادہ ہمیں کچھ علم نہیں ــ اپنے کشف کا یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت نے یہ بھی فرمایا مگر اب یہ بات نہیں ہے۔

حضرت کے مزاج میں بڑی شگفتگی تھی، کبھی کبھی اساتذہ وطلبہ سے مزاح بھی فرماتے تھے، اہل لکھنؤ کی نزاکت پر طنز کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کی ایک عورت اپنے شوہر سے خفا ہو گئی اور کہنے لگی کوئی ایسا بھی تو نہیں جو دو پیسے کی اربر کی دال لادے اور میں اسے کھا کر خودکشی کرلوں۔ اسی طرح لکھنؤ کے ایک بگڑے نواب کا قصہ ذکر فرماتے تھے کہ ان کے گھر میں سانپ نکل آیا تو کہنے لگے کوئی مردوا بھی تو نہیں کہ سانپ ماردے۔ گھر کی ملازمہ نے کہا حضور آپ بھی تو مرد ہیں؟ کہنے لگے اے ہاں ا ہم بھی تو مرد ہیں۔ یہ قصہ سنا کر حضرت خوب ہنسا کرتے تھے۔

جن لوگوں نے حضرت کو ان آخری آٹھ دس سال ہی میں دیکھا جب اسفار اور کاموں کی تھکن اور فکروں نے حضرت کو بالکل بٹھادیا تھا، وہ حضرت کی اس بے تکلفی اور شگفتگی کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔

آخر میں قارئین سے حضرت کیلئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔ نیز یہ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ حضرت کے نائبین کو صحیح معنی میں حضرت کا جانشین بنادے۔

MEENAR
SWEETS

مینار سویٹس

मदरसा अरबिया रियाजुलउलूम गेट के बगल में
मेन रोड चौकिया गुरैनी, जौनपुर

مدرسہ عربیہ ریاض العلوم گیٹ کے بغل میں
مین روڈ، چوکیہ گورینی، جونپور

MAIN ROAD, CHAUKIA, GURAINI,
JAUNPUR (U.P.) INDIA

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڑھ۔

"نمونۂ اسلاف"

اگر آج کسی سے پوچھا جائے کہ تم نے جنید و شبلی کو دیکھا ہے؟ بایزید بسطامی و ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کی ہے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی و خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کی ہے؟ خواجہ نظام الدین اولیاء و خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے ملے ہو؟ میاں جی نور محمد و حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہو؟ تو اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ نہیں! پھر اس سے پوچھئے کہ تم نے باندہ والے حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب کو دیکھا ہے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں انھیں دیکھا ہے، انھیں سنا ہے، ان سے مصافحہ کیا ہے، ان کا مہمان رہا ہوں، اگر وہ یہ کہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پچھلے بزرگوں کا جلوہ دیکھا ہے، جنید و شبلی کا علم و عرفان، بایزید بسطامی و ابوالحسن خرقانی کے مجاہدات و ریاضات، شیخ عبدالقادر جیلانی و خواجہ معین الدین چشتی کا فیضان عام، خواجہ نظام الدین و خواجہ نصیر الدین کی محبوبیت و اتباعِ سنت، میاں جی نور محمد و حاجی امداد اللہ کی روحانیت، سب کا نمونہ تم نے دیکھ لیا ہے۔ ؏

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب اس دور ظلمت میں ایک ماہتاب ہدایت تھے۔ اللہ کی قدرت کاملہ کی حجت بالغہ تھے، اسلام کی حقانیت کی دلیل و برہان تھے، وہ اس بات کے نشان تھے کہ آدمی خواہ کتنا ہی بے نوا ہو، ظاہری اسباب و وسائل سے تہی دامن ہو، دور افتادہ اور گمنام علاقہ میں ہو، جہل و ضلالت کے ماحول میں ہو، لیکن اگر اس کے پاس ایمان کی طاقت، توکل کا سرمایہ، یقین کی پختگی، محبت کی سرشاری، اللہ کے لئے اخلاص، سنت پر شیفتگی اور دین کا سچا درد ہو، نیز خدمتِ خلق کا جذبہ ہو، تو بے نوائی کی تہوں سے اس کے لئے بال و پر پیدا ہوں گے، اسباب و وسائل سے تہی دامنی، کامیابی کا زینہ بن جائے گی علاقہ کی گمنامی اس کی شہرت و قبولیت کا دروازہ ثابت ہوگی، جہل و ضلالت کی چٹانوں سے علم و معرفت کے سرچشمے اُبل پڑیں گے۔

حضرت مولانا جب اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے، تو ہندوستان ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو رہا تھا۔ انگریزوں کی حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی، ابتداءً حضرت نے ایک عربی مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، پھر خبریں ملنے لگیں کہ باندہ کے بعض علاقوں میں کم علم اور ناخواندہ افراد پر ارتداد کی یلغار کی جارہی ہے، اس خبر کو سن کر حضرت تڑپ اٹھے۔ کتابیں پڑھی تھیں اور خوب سمجھ کر پڑھی تھیں، کہ بعد میں اچھے

مدرس بنیں گے، اونچی کتابوں کا درس دیں گے، لیکن اب جو خبر سنی، تو یہاں مسئلہ اونچی کتابوں کا نہ تھا، اعلی مدرسی کا نہ تھا، دین وایمان کی بنیاد واساس کا تھا، اگر مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد لقمۂ کفر بن جائے، جنت سے نکل کر جہنم میں گر جائے، تو میرا پڑھنا لکھنا کس کام کا؟ پھر بھول گئے کہ مجھے کیا ہونا ہے؟ اور میں نے کیا پڑھا ہے؟ صرف ایک بات یاد رہی کہ مخلوق خدا کو عذاب جہنم سے بچانا ہے، نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دین، جسے مٹانے کی کوشش ہورہی ہے، اس کو زندہ کرنے کے لئے تو دکو مٹانا ہے، اس عزم کے ساتھ باندہ لوٹ آئے، جہاں آرام و راحت کا کوئی سامان نہ تھا، جہاں جاہ ومنصب کا کوئی نشان نہ تھا۔ جہاں علمی حوصلہ مندیوں کے لئے کوئی میدان نہ تھا۔ جہاں حضرت کہنا تو دور ہے، مولوی صاحب کہنے والے بھی کم ہی تھے، لیکن حضرت نے اللہ کے لئے عزت وآبرو، جاہ ومنصب، مال ومنال، شہرت و ناموری، سب کا خیال دل سے نکال پھینکا، مشکلات میں مردانہ وار قدم رکھدیا، اگر وہ چاہتے، تو اپنے یہاں سے قطع نظر کرکے کسی اونچے مدرسہ میں مدرسی اختیار کرلیتے، اور شہرت وعزت کا ایک خاص مقام پیدا کرلیتے، مگر اللہ کا یہ مخلص بندہ ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنے گھر پر ہی دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں ارتداد کی آگ جل رہی تھی، جل چکی تھی یا جلنے والی تھی، ایمان وعزیمت کی بارش لے کر پہونچ گیا، اور اس آگ کو بجھا کر رہا، اس عمل میں ایک مدت لگ گئی، بڑا مجاہدہ کرنا پڑا، مخالفتوں کے طوفان آئے، مشکلات کی چٹانیں کھڑی ہوئیں، مگر اس مرد خدا کے عزم وحوصلہ نے طوفانوں کا رخ موڑ دیا، چٹانوں کو چور کردیا، ارتداد کی آگ بجھ گئی تو خیال آیا کہ اب کوئی ایسا انتظام کرنا چاہئے، جس کے بعد دوبارہ یہ آگ نہ بھڑکے، احساس ہوا کہ مسلمانوں کے جہل نے اس آگ کو پھیلنے کا موقع دیا تھا انھیں اگر علم ومعرفت کے اسلحہ سے آراستہ کردیا جائے، تو دشمن پست ہوجائیگا بڑے بوڑھے، تو اپنی عمریں پوری کرچکے، جوان اپنی معاش میں سرگرداں ہیں، بچے ہی مستقبل کا سرمایہ ہیں۔ انھیں کسی طرح حاصل کرنا چاہئے اور ان کی علمی ودینی تربیت کرنی چاہئے، یہ دین کے بہترین سپاہی بنیں گے،

بس اسی خیال نے ہتھورا میں جو حضرت کا آبائی گاؤں ہے، بہت چھوٹا سا گاؤں، اسی گاؤں کی ایک مسجد میں حضرت کو بٹھا دیا اور اس طرح بٹھایا، کہ جب ملک الموت نے انھیں دنیا سے اٹھایا ہے، تو صحرا میں گلزار، اور جہل وضلالت کے ظلمت کدے میں علم ومعرفت اور نور حق کا ایک عظیم الشان قلعہ تیار ہوچکا تھا حضرت نے اس وقت سے وفات تک کتنے عظیم مجاہدے کئے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو دینی تعلیم سے آشنا کرنے کے لئے کتنی مشقتیں جھیلی ہیں، مخلوق خدا پر شفقت و محبت کی کیسی بارش برسائی ہے اللہ کے مخفی دروازوں کو کتنے جتن اور الحاح وزاری کے ساتھ کھٹکھٹایا ہے، خدا پر کس کس طرح توکل کیا ہے، اس کا نمونہ تو ہم جیسے بعد کے لوگوں نے بھی دیکھا، مگر ابتدائی دور میں

کیا رنگ تھا، اسے کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں، جو اس وقت حضرت کے دم اور قدم کے ساتھ تھے۔

حضرت خدمت و عبادت کے پیکر تھے، وہ اللہ کے بندے تھے، مخلص اور سچے بندے! وہ جو کرتے تھے، اللہ کے لئے کرتے تھے، نہ اپنے نفس کے لئے، نہ اپنے خاندان کے لئے، ان کا مرنا جینا اللہ کے لئے تھا۔ وہ خدا کی عبادت میں بہت چست تھے، نماز پنجگانہ تو خیر فرض ہے، اسکی پابندی اور اہتمام کا کیا پوچھنا، رات کے سناٹے کی عبادت و مناجات کا زندگی بھر ایسا التزام رہا کہ رحمت حق ٹوٹ پڑتی تھی، حضر میں ہوں، سفر میں ہوں، تندرست ہوں، بیمار ہوں، رات بھر کے جاگے ہوئے ہوں — اور یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ ہر حال میں انھیں رات کے اخیر حصے میں بیدار ہی پایا جاتا، اسمیں ذرا بھی سستی نہ ہوتی، میں نے انھیں دیکھا ہے ایک بجے رات کے بعد سوئے ہیں، صبح صادق کا وقت قریب ہے، آنکھ کھلتی ہے، اس طرح بجلی کی تیزی سے بستر چھوڑتے ہیں، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، بیتابانہ اٹھتے ہیں، حوائج سے فارغ ہو کر وضو کرتے ہیں اور پھر نہایت سکون کے ساتھ ہاتھ باندھ کر پروردگار کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں،

ساری رات سفر کیا ہے، سڑک پر گاڑی کے جھکولوں سے ہڈیاں چور چور ہیں، تکان سے بے حال ہیں، نیند کی وجہ سے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں، منزل پر پہونچے ہیں، تو تہجد کا وقت ہے، رفقاء سب خوابگاہ ڈھونڈھ رہے ہیں، بستروں پر گر رہے ہیں، اور حضرت لوٹا تلاش کر رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں، اور پھر نماز میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں، جیسے نہ انھوں نے سفر کیا ہے، نہ انھیں کوئی تکان ہے،

ایک بار ایک مدرسہ کے جلسہ میں بارہ بجے رات تک شریک رہے، وہاں سے اٹھے تو ایک صاحب اپنے گھر لے گئے، وہاں سے گاڑی پر بیٹھے تو دو بجے رات کو دوسرے صاحب اپنے گھر لے گئے حضرت کی دلداری ہے کہ ہر ایک کے گھر بے تکلف جا رہے ہیں، پھر اٹھے تو ڈیڑھ گھنٹے گاڑی پر چل کر ایک قصبے میں پہونچے، سارا قصبہ چشم براہ تھا لوگ انتظار اور شوق میں رات بھر سوئے نہیں تھے، ایک قافلہ قصبے سے ایک کیلومیٹر پہلے منتظر تھا حضرت کی گاڑی گذر گئی، وہ لوگ دوڑ پڑے، اور بھی قافلے جگہ جگہ راستہ دیکھ رہے تھے، حضرت قصبے کے اندر پہونچے تو پورا قصبہ مصافحہ کیلئے [illegible] کہا گیا کہ بعد میں مصافحہ ہوگا۔ ابھی حضرت کو [illegible] آرام کرنے دیں۔ لوگ رک گئے، حضرت کمرے کے اندر تشریف لے گئے، باہر عشاق کا ہجوم تھا۔ حضرت نے ایک رفیق سفر سے کہا کہ مجھے تھوڑی مہلت مل جاتی، رفیق سفر نے کہا کہ حضرت آپ آنکھ بند کر کے لیٹ جائیں آگے میں سمجھا لوں گا، اتنا سنتے ہی حضرت بلا تامل اور بلا تاخیر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے، اب اس رفیق نے سمجھایا کہ حضرت سو گئے ہیں۔ آپ لوگ اب دروازہ چھوڑ دیں، ہجوم ختم کر دیں، لوگ ہٹ گئے

اور حضرت واقعۃً نیند سے سو گئے، مگر شاید پندرہ منٹ گزرا ہو کہ حضرت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے، وہ رفیق ہکا بکا ہو گئے، حضرت آرام کیجئے، مگر اب آرام کہاں، وضو کیا، اور ہاتھ باندھ کر نماز میں مشغول ہو گئے۔

اللہ کی وہ محبت دل میں تھی کہ نیند کو وہ اڑا دیا کرتی تھی۔ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے بہت محبت فرماتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کا حال آپ نے بتایا کہ قوم ساروا لیلتھم حتیٰ اذا کان النوم احب الیھم مما یعدل بہ فوضعوا رؤسھم فقام یتملقنی ویتلو آیاتی۔

(مشکوٰۃ شریف)

اللہ تعالیٰ جن تین آدمیوں سے محبت فرماتے ہیں ان میں سے ایک شخص وہ ہے، کہ وہ کچھ لوگوں کیساتھ رات بھر چلا، پھر جب ان کو نیند ہر اس چیز سے پیاری اور محبوب ہو گئی، جو اس کے برابر ہو سکتی ہے، اور انھوں نے اپنے سر بستروں پر رکھ لئے، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ آدمی علیحدہ کھڑے ہو کر میری خوشامد کرنے میں اور میری آیات کی تلاوت میں لگ گیا۔

آپ غور کیجئے، حضرت وہی آدمی ہیں یا نہیں؟ پھر وہ اللہ کے محبوب کیوں نہ ہوں گے؟ وہ اس حدیث کے بہترین مصداق تھے، اے اللہ آپ ہمارے اور ایک مخلوق کی مخلوق کے حسن ظن کو سچا بنائیے۔

عبادت تو یہ تھی، اور خدمت کا حال تو ان بیشمار لوگوں سے معلوم کیجئے جنھوں نے حضرت اقدس کی ذات سے دینی اور دنیوی فوائد حاصل کئے ہیں، اور ایسے لوگوں کو کون گن سکتا ہے،

مخلوق کی خدمت وہی کر سکتا ہے، جس میں فنائیت اور تواضع درجۂ کمال کو ہو، اور پھر چستی اور مستعدی بھی بدرجۂ اتم ہو، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثواب طلبی کا جذبہ بھی کامل ہو۔ حضرت اقدس کی تواضع اور فنائیت کا کیا کہنا! اللہ اکبر! اللہ نے جو رتبۂ عظیم انھیں بخشا تھا، وہ عالم آشکارا تھا، مگر وہ ہر ایک کے سامنے بچھے جاتے تھے، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ وہ جسے کوئی نہیں پوچھتا، کوئی نہیں منہ لگاتا، وہ بھی حضرت کے پاس پہونچتا، تو سر پر بٹھایا جاتا، اسے بھی احساس ہوتا میں بھی پوچھا جا سکتا ہوں، وہ زمین پر گرے ہوئے سنگریزوں اور خس وخاشاک کو بھی نوازتے تھے، اسی لئے ان کے گزر جانے کے بعد جہاں اہل علم اور اہل کمال کو صدمہ ہوا اور انھوں نے ایک بڑا خلا محسوس کیا، وہیں وہ لوگ جو دوسروں کے نزدیک معمولی اور بے حیثیت ہیں، انھیں بھی محسوس ہوا کہ ان کے سر کا سایہ اٹھ گیا، اور وہ گرم دھوپ میں آ گئے۔

انھیں شاید کبھی بھول کر بھی اس کا خیال نہیں آتا تھا کہ ان کی بھی کوئی عزت ووجاہت ہے وہ ہر جگہ اپنے اس رنگ میں ممتاز تھے۔

اس فنائیت کا ثمرہ یہ تھا کہ حضرت اقدس ہمہ وقت، ہر شخص کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے، اپنے اہل تعلق کا وہ اہتمام کرتے تھے کہ خود آدمی اتنا اہتمام

نہ کرسکے، کوئی بیمار ہے اور آپ اس کے علاج کا اہتمام کر رہے ہیں، اخراجات کا انتظام کر رہے ہیں، کوئی پریشان حال ہے، آپ اس سے زیادہ پریشان ہو رہے ہیں دعائیں کر رہے ہیں، اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہے ہیں اور جب تک اسکی پریشانی دور نہیں ہو جاتی، آپ فکر مند رہتے ہیں، ان کے پاس پہونچکر ہر شخص قلبی راحت محسوس کرتا تھا۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے، کیا عالم اور کیا ناخواندہ سب انکے جگرکے ٹکڑے تھے۔

مدرسہ میں طلبہ آتے واپس کرنے کا دستور نہ تھا اپنے یہاں گنجائش نہ ہوتی تو دوسرے مدارس میں داخل کرتے اور پھر اسے یاد رکھتے، ایک طالب علم حضرت کی خدمت میں بیٹھا ہوا اصرار کر رہا تھا کہ میں اس لڑکے کو اپنے گاؤں سے لایا ہوں، اس کا داخلہ کر لیجئے، حضرت فرما رہے تھے کہ فلاں مدرسہ میں اسے داخل کردو، وہ یہیں داخلہ پر مصر تھا، حضرت فرما رہے تھے کہ اگر پیسہ نہ ہو تو میں تمہارا بھی اور اس کا بھی کرایہ دیتا ہوں، اسے لیجاؤ، لیکن وہاں مرغ کی ایک ہی ٹانگ تھی، دیکھنے والے اندر اندر کھول رہے تھے، مگر وہ طالب علم جما ہوا تھا، اور حضرت نے اسکی بات مان لی۔

حضرت مدرسے کبھی کسی طالب علم کا اخراج نہیں کرتے تھے، ایک بار فرمایا کہ کوئی مدرسہ ایسا بھی تو ہونا چاہئے، جہاں سے اخراج نہ ہوتا ہو۔

عجیب تھا یہ مرد درویش، فقیر بے نوا، ایک سادہ انسان تھا، لیکن ہزاروں کی زندگیوں میں رنگ بھر گیا۔

اسلاف کی چلتی پھرتی یادگار! پرانے بزرگوں کا نمونہ! ہم سے قریب اتنا قریب کہ جب چاہئے مل لیجئے، اپنی کہہ لیجئے، سکون حاصل کر لیجئے، مگر رتبہ و مقام کے لحاظ سے بعید، اتنا بعید کہ نگاہ اٹھائیے تو سر سے ٹوپی گر جائے۔

اب یہ شخصیت بھی چلی گئی، ہزاروں کے دلوں میں اپنی یاد، اپنی محبت چھوڑ کر چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، ہم بھی وہیں پہونچنے والے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

(صہ ۱۲ کا بقیہ)

بننا چاہئے اور دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کتنا کام لیا، اور اب کس طرح مقبولیت ظاہر ہوئی، اور خدا جانے کتنے بڑے بڑے مفکر، ادیب و شاعر گذر گئے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ انتقال کہاں ہوا، کہاں مرے، ایک تو اللہ کے بندے وہ ہیں، جو اگر غار کے اندر ہوں، یا پہاڑ کی چوٹی پر، اللہ تعالیٰ ہزاروں لاکھوں کو ان کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، اور پھر جو ان کے لئے دعائے مغفرت ہوتی ہے، جو ایصال ثواب ہوتا ہے، جو محبت کیجاتی ہے جو عقیدت ہوتی ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں، بس آپ اس سے فائدہ اٹھایئے، اور عبرت حاصل کیجئے، اور یہ اعجاز ہے قرآن مجید کا، قیامت تک رہنے والی کتاب کا ہے کہ تعلیم کے ساتھ درس بھی ہو، پڑھنا بھی چاہئے، پڑھتے بھی رہو، سکھاتے بھی رہو تو فائدہ پہونچے گا، بس اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور قاری صاحب کیلئے دعا بھی کرتے رہیں اور ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر بھی ایصال ثواب کریں۔ (بشکریہ تعمیر حیات ستمبر ۱۹۹۶ء)

مولانا عبدالوحید صاحب قاسمی
بارہ کمال، جونپور

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

۲۸ اگست ۹۷ء کے دن اپنے ضلعی اجتماع میں شرکت کیلئے جو مشہور عربی درسگاہ "ریاض العلوم" گورینی میں منعقد ہو رہا تھا زوال کے قریب پہنچا ابھی صحنِ مسجد میں داخل ہی ہوا تھا کہ مسجد کے بالائی مناروں پر بندھے ہوئے ہارن کی گھنگھناہٹ سنائی پڑی یہ زوال کا وقت تھا لوگ دوپہر کے طعام سے فارغ ہو کر استراحت اور قیلولہ کر رہے تھے ایسے بے وقت لاؤڈ اسپیکر کی کھنگھناہٹ نے سب کی سماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ معلن کی آواز فضاؤں میں بلند ہو رہی تھی کہ آج حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی کا انتقال ہو گیا بعد نمازِ مغرب باندہ میں نمازِ جنازہ ادا کیجائے گی۔ کانوں نے آواز سنی لیکن دل نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اتنی کڑوی بات دل کیونکر جلدی سے قبول کرتا حیرت واستفسار سے لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جو لیٹا تھا بیٹھ گیا جو بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا اجتماع کا سارا نظام معطل ہو گیا آخر یہ کیا ہو گیا یہ کیسی آواز ہے پچیس سال[ع] سے روزانہ اللہ کی کبریائی کی شہادت دینے والے مناروں کی آواز کو کون کہے کہ جھوٹی ہے ان سے تو ہمیشہ سچائی نشر ہوئی ہے اس لئے دل کو آواز کی سچائی پر ایمان لانے کے سوا چارہ نہ تھا سنا تھا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن سچ کی کڑواہٹ کا آج ایسا تجربہ ہوا جس نے تھوڑی دیر کیلئے ہم سب کو حواس باختہ کر دیا تھا

قاری صاحب کتنے دلوں کے مکین تھے کون بتا سکتا ہے اس لئے آپکی رخصتی پر آج کتنے دل ٹوٹے ہوں گے کتنی آنکھیں روئی ہوں گی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا گھر سنورتے سنورتے اجڑ گیا ہو۔

اے موت تو اتنی بے رحم کیوں ہے لاکھوں زندگیاں دوش زمین پر بار بنی ہوئی پڑی ہیں تو ان سے اپنی پیاس کیوں نہیں بجھاتی تو نے ان پر اپنا ہاتھ کیوں ڈال دیا جو لاکھوں کیلئے راحتِ دل تھا وہ تو پوری انسانی بستی کی مشترکہ ضرورت تھا اس فقیر امت کے پاس حضرت قاری صاحب جیسی چند شخصیات کا سرمایہ ہی تو بچا تھا تو نے وہ بھی لوٹنا شروع کر دیا، ان چند نفوس کو جن کی ضرب الا اللہ پر بقاء عالم کا مدار ہے ہم سے چھین کر ہماری دنیا کو قیامت کے حوالے کرنے میں تجھے کیا دلچسپی ہے، ابھی کتنے دن ہوئے کہ قاضی اطہر صاحب، مفتی محمود صاحب اور مولانا نعمانی صاحب کو تو نے ہم سے چھین لیا اور اب یہ تازہ حملہ ہے کیا تو نے کوئی آہٹ پالی ہے کہ: ب

ع مدرسہ کی عمر رفتہ ۲۵ سال ہے۔

اس عالم کی عمر پوری ہو چکی اس لیے ہمارے چراغوں کو بجھانا شروع کر دیا تاکہ قیامت کے خوفناک اندھیرے ہمیں بآسانی ختم کر دیں۔

آج سے پندرہ برس پہلے میں بمبئی یونیورسٹی میں میں زیر تعلیم تھا وہاں پر "کاندے ولی" میں ایک جلسہ ہونے والا تھا جس میں حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری کا اعلان تھا بچپن سے آغاز جوانی تک اکثر میری زندگی کی گھڑیاں بزرگی اور بزرگوں کی قربت و صحبت میں گذری ہیں لیکن اپنی بدقسمتی کہ صوفیانہ زندگی سے انس و شغف پیدا ہونے کے بجائے یک گونہ لاتعلقی ہی حصہ میں آئی اس لیے میرے لیے اس اعلان میں کوئی کشش کا سامان نہ تھا اس جلسہ کا اہتمام میرے رفیق درس اور مخلص دوست مولانا عبدالسمیع صاحب گونڈوی مبلغ دارالعلومؒ کر رہے تھے وہ مجھ سے عمر و علم میں بہت بڑے تھے لیکن وہ ایک بڑی عمر میں دارالعلوم دیوبند تکمیل دورہ کیلئے آئے تھے اس لئے ساتھ ہو گیا تھا انکی شانِ خطابت کا کیا کہنا دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی میں ہی ملک کے طول و عرض میں انکے تقریری دورے ہونے لگے تھے جانے کیوں انھیں مجھ سے اندھی محبت تھی ایسا مہربان مجھے کوئی اور نہیں ملا ابھی جوانی تھی کہ دنیا چھوڑ گئے خدا انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے انکی یادیں جب آجاتی ہیں تو دل مسوس کر رہ جاتا ہے یہ انکی یادوں کا فیضان ہی ہے کہ قلم موضوع سے ہٹتا جارہا ہے اور میں اس پر کنٹرول کرنے سے قاصر ہوں بہر حال

مرحوم دوست نے مجھے فون پر حضرت قاری صاحب کے آمد کی اطلاع دی اور جلسہ میں شرکت کی دعوت بھی دی اب یاد نہیں آتا ہو سکتا ہے اس سے قبل کہیں قاری صاحب کا نام سنا ہو لیکن اپنی یادداشت کے مطابق یہ پہلا موقعہ تھا جب قاری صاحب سے تعارف و ملاقات حصہ میں آئی ایک دوست کی دعوت پر حاضری میں دلچسپی تو تھی ہی میں بعد عصر پسنجر ٹرین سے کاندے ولی پہنچ گیا حضرت بعد مغرب تشریف لائے انکے لئے جائے قیام مخصوص تھی حضرت کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا اپنی طبیعت بچپن ہی سے شرمیلی واقع ہوئی ہے اس لیے بھیڑ میں گھس کر حضرت کی زیارت و ملاقات کی نہ ہمت ہوئی اور نہ ضرورت ہی محسوس کی بعد عشاء پروگرام تھا میں اسٹیج کا آدمی نہیں ہوں لیکن مولانا عبدالسمیع مرحوم نے مجھے اسٹیج پر نمایاں کرنے کیلئے ایک بہانہ ڈھونڈھ لیا اور مجھے نعت خوانی کیلئے غیر ضروری اور مبالغہ آمیز تعارف کے ساتھ اسٹیج پر بلایا، شعر گوئی اور شعر خوانی سے تعلق کے باوجود ان میں سے کسی کا سلیقہ مجھے نہیں ہے لیکن دوست کی آواز پر حاضری مجبوری تھی اس لیے میں نے وہاں جا کر دیارِ جونپور کے مشہور عالم دین مولانا جمیل احمد نذیری کی ایک نظم کے چند شعر پڑھے جسکا ایک شعر یوں تھا ؎

میرے ذوقِ یقیں پر روحِ ابراہیم جھوم اٹھے
مرے حسنِ عمل پر رحمتِ باری کو پیار آئے

میرے لب و لہجہ میں کوئی کشش نہ تھی لیکن

ایک اہلِ دل کا یہ شعر قاری صاحب کے دردمند دل کیلئے
اثر آفریں بن گیا جلسہ میں مولانا عبدالسمیع صاحب کی
پُرجوش تقریر ہوئی اور پھر حضرت قاری صاحب کا والہانہ
بیان ہوا جس کا کوئی حصہ بھی ذہن میں محفوظ نہیں ــــ
میرے دماغ کے کٹورے بھی بڑے کچے ہیں قیمتی سرمائے
بھی سنبھال کر نہیں رکھتے ہیں جن عظیم ہستیوں کے
سائے میں پلا ہوں اور جن اَبحُر العلوم کی حاشیہ نشینی
مجھے نصیب ہوئی اگر ان سے میں نے ایک ایک قطرہ
لیا ہوتا تو آج میرا دامن اقبالمندوں کیلئے بھی رشک
کے قابل ہوتا۔

بہرحال پروگرام کے خاتمہ پر مولانا عبدالسمیع صاحب
نے مجھے قاری صاحب کی خدمت میں حاضر کیا سادہ
لباس سادہ زندگی سادہ چہرہ جس پر تکلف کا کوئی
غازہ نہ تھا میرے سامنے تھا مولانا عبدالسمیع صاحب نے
فضیلت دارالعلوم اور پوسٹ گریجویشن تک تعلیم
اور اپنے ایک علمی دوست کی حیثیت سے میرا تعارف
کرایا حضرت نے مجھ پر نگاہ شفقت ڈالی اور میری
نعت خوانی پر اپنے دلی تأثر کا اظہار کیا۔ اس کے
بعد ہی قاری صاحب کی وہاں سے واپسی تھی اور قیام
شب بھنڈی بازار کے قریب ایک مسجد میں تھا مجھے
بھی اسی طرف آنا تھا ویسے تو میں صبح کو آتا لیکن قاری
صاحب کو جب معلوم ہوا کہ مجھے بھی اِدھر آنا ہے تو
انھوں نے اپنی کار میں ساتھ بٹھالیا، کار وہاں سے
روانہ ہو کر جب نئی منزل پر رکی تو یہاں پر حاضرین نے
مجھے مولانا کا رفیق سمجھکر احترام کی نگاہوں سے دیکھا اور تعظیم
کے حجرہ تک لے گئے حالانکہ میں مولانا کا رفیق نہ تھا بلکہ
"رفیقِ کار" Car تھا حجرہ میں داخل ہوئے تو آج کے
دن کی آخری چائے حاضر تھی چائے سے فراغت کے بعد
میں واپسی کیلئے حضرت سے اجازت لینے کھڑا ہوا تو آپ
نے پوچھا یہاں سے کتنی دور پر رہتے ہو میں نے بتایا بالکل
قریب ہی میرا روم ہے اور وہاں پہنچنے میں کوئی دشواری
نہیں ہے آپ نے متبسم لہجے میں فرمایا جب قریب ہی ہے
تو رات کی تاریکی میں جاکر روم والوں کو پریشان کرنے
سے کیا فائدہ یہیں پر سوجاؤ صبح چلے جانا یہ کہتے ہوئے
آپ نے حاضرین اہل خدمت سے اشارہ کیا اور تھوڑی
ہی دیر میں ایک ہلکا سا بستر حضرت کے پہلو میں میرے
لئے لگ گیا بمبئی کی رات نہ سرد ہوتی ہے نہ گرم اسلئے
بستر کے تکلفات وہاں زیادہ نہیں ہوتے رات زیادہ
گذر چکی تھی میں نے وہیں پر سوجانا ہی مناسب سمجھا چند
ہی لمحوں بعد حاضرین الوداعی سلام کر کے رخصت ہو گئے
تاکہ حضرت آرام فرماسکیں میں نے اٹھکر اندر سے کمرے
کی کنڈی چڑھادی اور اپنے بستر پر چلا گیا حضرت
ابھی بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں کچھ علمی باتیں نکل پڑیں
میری عجیب فطرت ہے کہ علماء اور اہل اللہ سے ڈرتا ہوں
اور انکی مجالس سے کتراتا ہوں لیکن جب کبھی ایسی
بارگاہوں میں بار ملتا ہے تو اپنی کج بحثی سے بھی باز
نہیں آتا حضرت سے بھی علم وتعلیم فن قراءت کے
ضرورت واہمیت نیز بعض سیاسی حالات پر گفتگو

ہوتی رہی حضرت میرے استفسارات کا پورے نشاط وانبساط کے ساتھ جواب دے رہے تھے آنکھوں میں نیند کا کوئی خمار نہ پاکر میں نے بھی گفتگو دراز کردی اور گھنٹوں گفتگو جاری رہی حضرت کی دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیات میرے سامنے تھیں حضرت مہمان تو تھے ہی پھر لائق تعظیم واحترام تھے پھر تھکے ہوئے تھے مگر میں نے ان حیثیتوں پر نظر نہیں کیا اور نہ آپکی بوڑھی عمر پر رحم کیا یہانتک کہ شب اپنے آخری چھٹے حصے میں پہنچ گئی اس کے بعد قاری صاحب نے فرمایا اب دیر ہو چکی ہے اب سو جاؤ ابھی نوعمر ہو صبح کو تمہارے اپنے کام بھی ہوں گے میں نے سمجھا کہ شاید حضرت کو نیند کا احساس ہو رہا ہو اس لئے میں رخ موڑ کر سو گیا، بچپن سے گہری نیند سونے کا عادی ہوں سچی بات یہ ہے کہ نیند سے میں کبھی آسودہ نہیں ہوا شب قدر اور ایام عسل کی راتیں بھی مجھے کمل بیداری میں کبھی نہیں ملیں لیکن آج جب حضرت کی خلوت شب کی مہمانی نصیب ہوئی تو دل میں ایک کھٹک سی تھی کہ کہیں میرے سونے کا بے ہنگم انداز حضرت کیلئے تکلیف دہ نہ ہو اس لئے بڑے محتاط انداز میں سمٹ اور سمیٹ کر سویا مگر نیند کا ہلکا جھٹکا آیا تھا ہی کہ نصف گھنٹے سے کم میں آنکھ کھل گئی دل میں حضرت کی معیت کی کھٹک تو تھی ہی اس لئے فوراً نظر ادھر گئی تو دیکھا کہ حضرت قبلہ رو اللہ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کی آواز میں اشک آلود نگاہوں کے ساتھ تلاوت قرآن میں مصروف ہیں میں حیرت میں پڑ گیا مجھے آپکے دن بھر کے سفر کا حال معلوم تھا لوگوں کے اژدہام میں شام گذری تھی چار گھنٹے اسٹیج پر بیٹھنا اور بیان کرنا پھر ڈھائی گھنٹہ کی سمع خراشیوں کی میری جسارت بیجا ان سب کے باوجود یہ بوڑھا بدن کیونکر استادہ ہے کونسی طاقت ہے جو اسے رات کی پرسکون گھڑیوں کا سکون چھین کر کھڑے ہونے پر مجبور کر رہی ہے میں سوچ میں پڑ گیا حضرت نے مجھ سے کہا تھا تم سوجاؤ ابھی نوجوان ہو لیکن مجھے سوجانے کی تلقین میری نوجوانی پر رحم نہیں تھا میں نے خیال کیا تھا کہ حضرت کو غالباً نیند کا احساس ہو رہا ہے مگر میرا تصور باطل تھا آپ نے مجھے اس لئے سلایا تھا کہ میں آپ کا وہ سب کچھ نہ دیکھ سکوں جسے آپ دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر کرنے کے عادی تھے لیکن مجھے اپنی آنکھوں کی قوتِ دید پر ناز ہے کہ دیکھنے کے قابل ہر چیز دیکھ لیتی ہیں۔

میں سعودی عرب جا رہا تھا بیرونی اسفار کیلئے ڈاکٹری معائنہ کی ایک لازمی شرط ہوتی ہے اس لئے میں ایک ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کرانے کیلئے گیا اس نے سب کچھ دیکھنے کے بعد آنکھوں کو ٹسٹ کیا وہ ایک تختی پر لکھے ہوئے حروف پڑھا رہا تھا ایک آنکھ حروف کو پڑھنے میں ناکام رہی اس نے کہا آپ کی ایک آنکھ تو ٹھیک نہیں ہے میں ڈرا کہ کہیں اس رپورٹ پر میرا سفر نہ رک جائے میں نے ڈاکٹر سے فوراً کہا ڈاکٹر

صاحب میرے جسم کے جس حصے کو چاہیں فیل قرار دیدیں
مجھے کوئی اعتراض نہیں خدا کیلئے میری آنکھوں کو فیل نہ کریں
ان پر مجھے بہت اعتماد ہے میں نے ان سے بہت کام
لیا ہے یہ جو دیکھتی ہیں صحیح دیکھتی ہیں آج کی دنیا پردے
پر کیا ہے اسے دیکھنے کی عادی بن رہی ہے میں نے
اپنی آنکھوں کو پسِ پردہ حقیقت کو دیکھنے کی عادت
لگائی ہے ڈاکٹر مسکرایا اور اس نے مثبت رپورٹ
میرے حوالے کر دیا۔

میری آنکھوں نے آج بھی ایک حقیقت دیکھا
تھا لیکن میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں
اور گہری نیند کے تکلف کی چادر اوڑھکر سوگیا تاکہ حضرت
کی منشاء پوری ہو جائے اور وہ جانیں کہ میں نے حضرت
کا کوئی راز نہیں جانا میں نے حضرت کی اس منشاء کے
احترام میں پوری زندگی شبِ خلوت کی اس کہانی کو
کبھی بیان نہیں کیا اور اب کہ حضرت ہماری دنیا میں
نہیں رہے انکی روح سے معذرت کے ساتھ افشاء راز
کر رہا ہوں۔ پھر نماز فجر کے وقت اٹھا اور ادائیگی فجر
کے بعد حضرت سے میں نے رخصتی کی اجازت چاہی
حضرت نے فرمایا ابھی تھوڑی دیر میں چائے آرہی ہے
پی لو پھر جانا کچھ ہی لمحوں میں چائے مع لوازمات حاضر
کی گئی میں نے اسمیں شرکت کی اور الوداعی سلام ومصافحہ
کرکے واپس ہوگیا حضرت کی خلوت شب کی اس صحبت
اور بن بلائے مہمانی کی اس سعادت پر نازاں ہوں
لے سفر زندگی کی عظیم دولت سمجھتا ہوں اور سرمایۂ نجات
بھی کہ ؎

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

اسی واقعہ پر ایک عرصہ گذر گیا میں اپنی زندگی
کی پُرپیچ وادیوں کو قطع کرتا رہا، حضرت سے قرب
وتعلق کا کوئی اتفاق پھر برسوں نہیں ہوا لیکن دور ہی
دور سے حالات سنکر حضرت سے عقیدت بڑھتی رہی
اور جانے کیوں ادھر چند سالوں سے دل کا رُخ کچھ پلٹا
ہوا دکھائی پڑا کچھ تو میرے مخلص علمی احباب کے اصرار
اور کچھ عمر رفتہ کی بیکاری پر احساس ندامت نے میرے
دل میں کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا داعیہ پیدا کیا
اوّلاً حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب جلال آبادی
سے بیعت کا ارادہ ہوا دار العلوم سے فراغت کے معاًبعد
استاذ محترم مولانا مفتی محمود حسن صاحب کے حکم پر ایکدن
کیلئے حضرت جلال آبادی کے آستانہ پر حاضری دی تھی
لیکن اس وقت نوعمری کی آوارہ دماغی نے بیعت کو
قید وبند سمجھا اور یہ سعادت نصیب نہ ہوئی اب کہ جب
داعیہ ابھرا تو پھر وہی در نظر آیا لیکن میرا ارادہ ہنوز عمل
کی دہلیز تک نہیں پہنچا تھا کہ حضرت جلال آبادی خدا کو
پیارے ہوگئے اور اک ولی اللہ کے بقول میں ایک
مادر زاد ولی کی صحبت سے محروم ہی رہ گیا۔ فیا للاسف!

اس کے بعد جب از سرِ نو ارادہ ہوا تو ایسا محسوس
ہوا کہ جیسے کوئی اجنبی کشش مجھے حضرت باندوی سے
تعلق بیعت کرنے پر آمادہ کر رہی ہو میں نے اب عزم کرلیا

تھا کہ ایسا کرلوں مگر اپنی عجلت پسند فطرت کے باوجود بیعت میں عجلت روا معلوم نہیں ہوئی ابھی دو سال قبل حضرت قاری صاحب جامعہ فاروقیہ صبرحد کے ایک جلسہ میں تشریف لائے جلسہ کی نظامت میرے سپرد تھی اسٹیج پر حضرت سے ملاقات ہوئی خیال ہے کہ بمبئی کے بعد یہ حضرت سے ملاقات کا دوسرا موقعہ تھا لیکن اجلاس کی بھیڑ میں کسی اور قسم کی گفتگو کا موقعہ نہیں ملا حضرت رخصت ہوگئے اور میرے دل کی بات لب پر نہ آسکی۔

اس کے پندرہ روز بعد ہی میں ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ سردھنہ (میرٹھ) گیا ہوا تھا ایک مسجد میں میری جماعت رُکی ہوئی تھی رمضان المبارک کا مہینہ تھا صبح دس بجے کا وقت کہ شہر کے کچھ ذمہ دار آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ حضرت قاری صاحب کا یہاں سے گذر ہورہا ہے ہم لوگوں کی درخواست پر تھوڑی دیر کے لئے وہ یہاں رک گئے ہیں ابھی تھوڑی دیر بعد اسی مسجد میں حضرت کا بیان ہوگا شہر کی تمام مساجد میں اعلان کرایا جارہا ہے لوگ جب یہاں آنے لگیں تو تم (راقم) انھیں جوڑ کر کچھ بات کرو چنانچہ حضرت کے نام پر جمع ہونے والے لوگوں سے میں نے اپنی لن ترانیاں شروع کردیں اسی مجمع سے جس میں خواص شہر اور تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تھا میں نے ایک گھنٹہ بات کی، حضرت تشریف لائے تو پہلے مسجد کے اندرونی حصہ میں جاکر دوگانہ نماز ادا کی پھر تشریف لائے میں کرسی کے نیچے آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا آپ کا بیان ہوا دعا ہوئی اور لوگ مصافحہ کیلئے ٹوٹ پڑے حضرت نے مجھ سے کہا کہ تم ایک طرف کھڑے ہوجاؤ اس طرف سے کوئی نہ آئے سب لوگ ایک طرف سے آئیں اور دوسری طرف سے مصافحہ کرکے نکل جائیں میں اسی خدمت پر مامور ہوگیا بلا مبالغہ پون گھنٹے سے زیادہ دیر تک مصافحہ کی لائن لگی رہی جب سب لوگ فارغ ہوچکے تو میری باری آئی میں نے ہاتھ ملایا تو آپ نے دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے رکھا اور پھر پوچھا کہ آپ یہیں کے رہنے والے ہیں آپ سے جلد ہی کہیں ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ ابھی چند ایام قبل جامعہ فاروقیہ صبرحد جونپور تشریف لائے تھے وہاں جلسے میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی میں نے آگے بتایا کہ صبرحد کے قریب ایک موضع بارہ کماں ہے میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔ حضرت نے یہ سنکر مجھے بھرپور نظروں سے دیکھا جیسے میرے چہرے میں کچھ اور دیکھ رہے ہوں پھر بولے کہ تم مولانا عبدالرشید (مرحوم) کے بیٹے تو نہیں ہو!

تیس سال سے بچھڑے ہوئے باپ کا نام حضرت کی زبان سے سنکر بدن کے رونگٹے کانپ گئے یتیمی کی زندگی کی ساری کہانی آنکھوں میں اتر آئی زبان شرمائی ہاں نہیں کہہ سکی میری جیسی ناخلف اولاد خلف الرشید نہیں ہوسکتی لیکن سر اثبات میں ہل گیا حضرت نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بولے کہ میں برسوں سے تمہیں ڈھونڈھ رہا ہوں اور لوگوں سے تمہیں پوچھ رہا ہوں

مجھے معلوم ہوا تھا کہ مولانا مرحوم کے کوئی اولاد ہے مگر تم سے ملاقات نہ ہو سکی تھی مولانا میرے مخلص دوست اور تعلیم و تدریس کے ساتھی تھے برسوں ہم دونوں ایک کمرے میں رہے تھے فرمایا کہ میں بہت پہلے تمہارے گھر جا چکا ہوں پھر ہمارے گھرانے کی خام بیٹھک اور صحن دروازہ وغیرہ کے متعلق بتانے لگے جسکا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے پھر موجود لوگوں سے کہنے لگے اے بھائی یہ مولانا (راقم) تو میرے دوست کے لڑکے ہیں مولانا عبدالرشید صاحب بہترین مقرر اور اچھے عالم تھے ہمارا انکا بڑا ساتھ رہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے ساتھ اپنے کمرے تک لے گئے جہاں تھوڑی دیر آرام کرکے آپ کو مرادآباد واپس جانا تھا واپسی کے وقت میں نے الوداعی مصافحہ کیا تو فرمایا کہ آج بڑی جلدی ہے تم سے کچھ بات نہ ہو سکی ابھی بہت باتیں تم سے کرنی ہیں کبھی باندہ آجاؤ میں نے حضرت سے باندہ پہنچنے کا وعدہ کیا اور پھر کار چل پڑی میری نگاہیں اس نئے تعارف کی گمبھیر چھاؤں میں دیر تک حسرت و عقیدت کے ساتھ حضرت کی کار کا تعاقب کرتی رہیں

اسی واقعہ پر دو سال گذر گئے اور اس دوران کوئی دن ایسا نہیں گذرا جب حضرت کی یاد آئی ہو اور میں نے باندہ پہنچنے کا وعدہ از سر نو دل میں تازہ نہ کرلیا ہو حضرت اسی دوران ایکبار گورینی تشریف لائے تو وہاں سے میرے متعلق معلومات کرکے میرے مدرسہ دائمی آدم پور جونپور پہنچے کہ اسی راہ سے حضرت کا گذر بھی ہو رہا تھا کار سڑک پر رکی اور ایک آدمی نے اندر آکر میرے متعلق پوچھا بدقسمتی سے میں موجود نہ تھا حضرت کی گاڑی سڑک ہی سے واپس ہو گئی اور میری آنکھیں اور مدرسہ کی سرزمین حضرت کی قدمبوسی سے محروم رہ گئیں دن رات گذرتے گئے اور فرصت کے ایک لمبے وقت کی تلاش باندہ جانے کیلئے جاری رہی اب کہ مکمل ارادہ تھا کہ شعبان کی چھٹی میں پہلا کام حضرت کے آستانہ کی حاضری ہوگی مگر اے ماہ شعبان تو مجھ سے کتنا دور چلا گیا اور یہ کیا ہوا کہ میرا داعیۂ دل میرا ارادۂ بیعت، حضرت کیساتھ انجانی کشش اور آبائی تعلق نیز میرا وعدہ سب کے سب میرے کوڑھی جسم کو باندہ پہنچانے میں ناکام ہو گئے اور میرا خانۂ دل سنورتے سنورتے اجڑ گیا اسی لئے ۲۸ اگست کو بوقت زوال جب میرے کان میں حضرت کی دنیا سے رخصتی کی آواز پڑی تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری زندگی کے ساری امنگوں خواہشوں اور جذبوں پر زوال آگیا ہو۔ حسرت و افسوس کے عالم میں ہاتھ سینے پر گیا تو دل کی دھڑکنوں کی موسیقی مجھ سے یہ سرگوشی کر رہی تھی کہ:۔

شفا کو ڈھونڈھنے اب کسکے در پہ جاؤ گے؟
پیاس دل کی وہ دید اب کہاں بجھاؤ گے؟
وہ ایک زاہد شب زندہ دار تھا، نہ رہا!
وہ چارہ سازِ دلِ بیقرار تھا، نہ رہا!

مولانا محمد یونس صاحب صدیقی
مدیر دعوت الحق، کروی ۱۰، ترکیسر گجرات۔

حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی قدس سرہ کی رحلت

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء جمعرات

…نت سے آگیا تھا! صدیق سا فرشتہ!
…ہتا تھا خاکیوں میں حق سے تھا اسکا رشتہ

…حلت سے اُسکی عالم کیوں ہو نہ جائے سُونا
تھا دورِ پُر فتن میں اصحابؓ کا نمونہ

…با صد کمال و خوبی تھا مسکنت سراسر
…چشمِ غنا میں اُسکی شاہ و گدا برابر

…یثار اور تواضع تھی بن گئی طبیعت
…دل اُسکا شاد ہوتا چھوٹوں کی کرکے خدمت

…وہ الفت و محبت وہ شفقت و مروّت
…سب کا شریکِ غم تھا تھا غمگسارِ امّت

…ٹے ہوئے دلوں کا بنتا تھا وہ سہارا
…دُکھ رنج و غم کسی کا اسکو نہ تھا گوارا

اپنے ہوں یا پرائے تھا فیض عام اُسکا
ہر اِک کے کام آئے بس یہ تھا کام اُسکا

خلقِ خدا کی خدمت باوصفِ ضعفِ پیری
دور و دراز جاکر کرتا تھا دستگیری

خدمت میں اُسکی جاکر پاتے تھے سب تسلّی
قلبِ شفیق پر تھی رحمٰن کی تجلّی

دیتا تھا پیار سب کو تو اسکو پیار دے دے
پروردگارِ عالم رحمت میں اسکو لے لے

وہ نیکیوں کا پیکر فردوس کو سدھارا
اللہ کی رضا پر کیا زور ہے ہمارا

ہاں یاد آرہی ہیں اسکی وہ ساری باتیں
وہ شفقت و محبت وہ پیاری پیاری باتیں

اُس مہرباں خدا کو اُن پر جو پیار آیا فرمان ہے نبیؐ کا دنیا ہے جیل خانہ
تکلیف سے چھڑا کر آرام میں بلایا مرحوم کو مبارک ایماں کے ساتھ جانا

جتنے عزیز پہلے دنیا سے جا چکے ہیں یہ عارضی جدائی بالکل ہی مختصر ہے
کتنی خوشی کی جا ہے سب انکو مل گئے ہیں ہر آن ہم سبھی کا اُس سمت ہی سفر ہے

سب انبیاء ملے ہیں سب اولیاء ملے ہیں دنیا ہے سُکھ سے خالی دُکھ چار سُو بھرا ہے
اللہ رے مقدر تو د مصطفےٰؐ ملے ہیں غم کے سوا جہاں میں سُوچو تو کیا دھرا ہے

اب اپنی نیکیوں کا ثمرہ وہ پا رہے ہیں ہم سب بھی اس سفر کی تیاریاں کریں گے
ہم رُو رہے ہیں۔ وہ تو خوشیاں منا رہے ہیں یونس یہ عہد کرلو اسلام پر مریں گے

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۝

اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا

(صـ۱۲۶ کا بقیہ)

اپنے اسلاف کا نمونہ تھے آپ خود تو ہم سے پردہ فرما گئے لیکن اپنے پیچھے ہمارے لئے اپنی تعلیمات اور اپنے اوصاف وکمالات کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں کہ ہم ان سے اپنی ہمت اور وسعت کے بقدر استفادہ کریں اور انکی روشنی میں آپکے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

اور احسان مندی کے تقاضے سے ہم پر یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ ہم قاری صاحب کیلئے دفعِ سیئات اور رفع درجات کی دعا کریں اور آپکے لئے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کریں اور ہمارے لئے سب سے اہم جو چیز ہے وہ یہ کہ اب جو اکابرامت ہمارے اوپر سایہ فگن رہ گئے ہیں انہیں اللہ رب العزت کیجانب سے اپنے حق میں غنیمت جانیں، انکی قدردانی کریں اور ان سے بھرپور دینی و اصلاحی استفادہ کی کوشش کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم غافل کے غافل ہی رہیں اور خداوند قدوس کی جانب سے ملی ہوئی یہ عظیم نعمتیں ہماری ناقدری کی بنا پر ہم سے چھین لی جائیں۔

اللّٰھمّ احفظنا منہ

دنیائے تصوف کا شہنشاہ گیا

حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی ؒ کی ابدی مفارقت

از : مولانا محمد زبیر صاحب اعظمی، ایولہ ضلع ناسک

ہندوستان ہمیشہ سے علماء و مشائخ، مصلحین و مرشدین، محدثین و مفسرین اور مصنفین و مؤلفین کا گہوارہ رہا ہے۔ چشم فلک نے جتنے روشن ستارے اس دھرتی پر دیکھے ہیں اسکی مثال بہت کم ہی مل سکتی ہے۔ اسلام کے مبلغین نے پہلے ہندوستان کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کرایا۔ پھر ایک طرف مدارس کے ذریعہ علوم دینیہ کی نشر و اشاعت ہونے لگی اور دوسری طرف سالکین و عارفین نے اپنی اپنی خانقاہوں میں توحید و معرفت کے جام چھلکائے۔ خدا کے فضل و کرم سے یہاں علم و عمل کی آغوش میں پل کر ایسی ایسی ہمالیائی شخصیات وجود میں آئیں جو ہمہ جہتی صفات فاضلہ کی حامل تھیں، ہم ماضی قریب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ایسے علماء حقانی نظر آتے ہیں جو اگر ایک ہی میدان کے شہسوار ہوتے تو بھی ان کا نام جریدۂ عالم پر ہمیشہ کیلئے ثبت ہو جاتا لیکن یہاں کی خاک سے مختلف صفات سے متصف ایسے ایسے افراد اٹھے جو بیک وقت کئی کئی میدانوں کے کارواں سالار ثابت ہوئے۔ ولی اللّٰہی خاندان کے افراد سے لیکر مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ، مولانا اشرف علی تھانوی ؒ، مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی ؒ، اور ایسے ہی بہت سے گنجہائے گرانمایہ ہیں جو علوم متداولہ پر مکمل عبور اور تصنیف و تالیف کے ساتھ ہی سلوک و معرفت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ اور عوام و خواص سب کے لئے فیض رسانی کا کام آپ حضرات کی ذات سے انجام پاتا تھا۔ یہ حضرات علوم شرعیہ کی تعلیم کیلئے مدرسے قائم کرتے اور خود بھی تعلیم دیتے تھے۔ خانقاہوں میں بیٹھ کر اصلاح و تزکیہ کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ اسلام کی حفاظت کیلئے مناظرہ کا پلیٹ فارم گرم کرتے تھے۔ غلامی سے آزادی دلانے کیلئے بے مثال جانبازی اور بہادری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسطرح کبھی معلم کبھی مصلح کبھی خطیب اور کبھی سپہ سالار بن کر دین اسلام کی پاسبانی اور بالادستی کیلئے تمام تدبیریں کرتے تھے۔ ان کے زریں کارناموں سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں۔

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی ؒ انھیں نفوس قدسیہ کے ایک ممتاز فرد اور اپنے نام کی

مناسبت سے صدیقیت کے حامل تھے جو ۲۸ اگست ۹۷ء کو ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے۔ خدا کی بات خدا ہی جانے لیکن ملت اسلامیہ ابھی اہم اکابر مثلاً مولانا انعام الحسنؒ، مولانا مفتی محمود الحسنؒ، مولانا محمد عمر پالن پوریؒ، مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ وغیرہ کے ماتم سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک تازہ زخم حضرت باندوی کی مفارقت سے لگا جس نے ہزاروں دلوں کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ اس کو ملت کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جائے۔ لیکن نہیں۔ بندۂ مومن کو خدا کے ہر کام میں مصلحت کا پہلو ضرور نکال لینا چاہئے پس کچھ شک نہیں کہ یہ خدا کیطرف سے ہماری آزمائش و ابتلاء کی ایک اہم کڑی ہے لیکن اس کا راز وہی حکیم و خبیر اچھی طرح جانتا ہے جسکی دو انگلیوں کے درمیان کائنات کا پورا نظام ہے۔ بندے کا کام قضا و قدر کے فیصلہ پر راضی رہنا ہے خواہ اس کے لئے دل پر کتنا ہی جبر کرنا پڑے۔ وہ بندگی ہی کیا جو خدائی فیصلوں پر تنقید کرنے لگے؟ حضرت قاری صاحبؒ کو ادھر تین چار سال کے عرصہ میں متعدد بار دیکھنے اور سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ مہاراشٹر کے علاقہ میں ان کو لانے کا سہرا مولانا غلام محمد وستانوی کے سر ہے جو اپنی شانوں کی عمارتوں اور مساجد کے افتتاح کیلئے نیز مسابقۃ القرآن اور سالانہ اجلاسوں کے موقعہ پر انھیں لانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان کے دیدار و ملاقات کیلئے دور دور سے لوگ کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے۔ ان میں عوام اور علماء سبھی ہوتے تھے لوگ سراپا شوق بن کر انکی

ناصحانہ باتوں، حکیمانہ کلمات اور قرآن و حدیث کے فرمودات سنتے اور بہت سے لوگ بیعت بھی ہوتے تھے۔ پھر بیان کے بعد مصافحہ کیلئے وہ اژدحام ہوتا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ سب سے مصافحہ کرنا بھی بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ آسان کام نہیں لیکن حضرت قاری صاحب صبر و حلم کی تصویر بن جاتے تھے اور کسی کو محروم نہیں کرتے تھے حالانکہ تھکن کے باعث ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی لیکن دلداری و دلجوئی جس کے خمیر کا حصہ ہوتی ہے اسکی پیشانی پر شکن پڑنا تو دور کی بات ہے کسی زاویہ سے ناگواری کی بو بھی نہیں آتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مصافحہ کے خود مشتاق ہیں اور اسمیں انھیں ایک چاؤ اور لذت مل رہی ہے۔ اللہ والوں کی یہی بہت بڑی علامت توجہ کے قابل ہے کہ وہ کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھتے اور نہ محروم کرتے ہیں۔

حضرت باندوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز تھے اور وہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے۔ بنا بریں انکی مجلس اور طریقہ اصلاح میں خانقاہ تھانوی کا رنگ جھلکتا تھا۔ آپ بڑی لمبی چوڑی تقریر نہیں کرتے تھے۔ آپ کے بیان میں کوئی تصنع نہیں ہوتا تھا آپ لسانی و لفاظی اور امتیازی شان پیدا کرنے سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ پھر بھی جو چند جملے زبان سے نکلتے تھے وہ دل میں اترتے چلے جاتے تھے سامعین کو اپنے معاصی اور عیوب صاف نظر آجاتے تھے اور وہ یہ محسوس کرنے لگتے تھے کہ ہم سے بڑا خاطی اور گنہگار کوئی نہیں ہے۔ اور احساس کی یہی دولت تزکیۂ باطن

راہیں ہموار کرتی اور دل کو سنوارتی ہے۔ چنانچہ آپ کی صحبت میں رہ کر اور آپ کی آتش نفس میں تپ کر ہزاروں انسان فولاد سے کندن اور سنگریزے سے ہیرے بن گئے۔ یہ کرشمے تھے اس بھولے بھالے مسیحا نفس انسان کے جو ایک گمنام مقام میں سکونت پذیر تھا لیکن مشک کی خوشبو چھپائے چھپ نہیں سکتی اس لئے وہ دین کے دیوانوں اور شمع دین کے پروانوں کو ہند ہی نہیں بیرون ہند سے بھی کھینچ کھینچ کر ہتھورا پہنچا دیتی تھی۔ پھر چند دن قیام کرنے اور صحبت میں رہنے کے بعد جو کوئی وہاں سے لوٹتا اس کو یقین ہوتا تھا کہ میں دنیا کی عظیم ترین دولت سے دامن بھر کر اپنے گھر جا رہا ہوں۔ اور یہ صد فیصد حقیقت ہے۔ بھلا ایمان و یقین اور باطن کی داروئے شفا سے بڑھ کر اور کون سی دولت ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ سب قدر دانوں کیلئے ہے۔ ناقدروں کی نگاہ میں تانبے اور سونے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ہمارے اکابر تفنن طبع کے طور پر کبھی کبھی شعر گوئی بھی کر لیتے تھے۔ ان کے اشعار علم و حکمت کے شہ پارے مثلاً حمد و مناجات، نعت و منقبت اور اظہار حقائق کے حامل ہوتے تھے۔ حضرت قاری صاحب کو بھی خدا نے شعر گوئی کا خاصا ملکہ عطا کیا تھا۔ لیکن انھوں نے بھی دیگر بزرگان دین کیطرح اس کی طرف کچھ خاص توجہ نہیں دی کیونکہ خدا کو آپ کی ذات سے مخلوق کی حقیقی نفع رسانی اور اصلاح و ہدایت کا کام لینا تھا، پھر بھی جو تھوڑے سے اشعار آپ نے تخلیق کئے، وہ بہت خوب ہیں فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست، الفاظ کی مرصع بندش اور ترکیب کی خوبی غرض تمام شعری محاسن سے آپ کا کلام بھرپور ہے۔ آپ کی دو تین نعتیں طلبہ کی زبانی کئی جلسوں میں مجھے سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ سن کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اگر آپ سخن گوئی کیطرف کچھ زیادہ التفات فرماتے تو یقیناً صف اوّل کے حقیقت گو شعراء میں آپ کا شمار ہوتا۔ ایک بار آپکی ایک نعت مقبول و مشہور پندرہ روزہ "تعمیر حیات" میں شائع ہوئی تھی جو آپ نے اپنی لمبی بیماری کے دوران کہی تھی۔ اس کا ہر شعر اسقدر اثر انگیز اور شعری خوبیوں کا حامل تھا کہ اس پر تبصرہ کرنا مجھ کم علم اور فرومایہ سے ممکن نہیں۔

یہاں پہنچ کر اپنی کتاب "ذرہ سے آفتاب" کی ایک عبارت نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جس میں جامعہ اکل کوا کا تذکرہ ہے اور جو دنیا میں ابھی ابھی طبع ہوئی ہے جس وقت کتاب طباعت کے آخری مراحل میں تھی حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ سے جاملے لیکن بہرحال تقریباً پوری کتاب میں آپ چلتی پھرتی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ آپ کا ذکر خیر ہی کتاب کو بابرکت اور مشہور و مقبول بنانے کیلئے کافی ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو!۔

"اس ادارہ (جامعہ اکل کوا) کو روز اوّل سے وقت کے ایک عظیم مصلح و مربی اور عارف و مرشد حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب دامت فیوضہم کی اعلیٰ ترین سرپرستی حاصل ہے جو اس کے لئے فال نیک اور اس کے عروج و ارتقاء کا زینہ ہے۔ آپ کے فیوض و

برکات اور رشد و ہدایت کی نہر رواں ہندوستان کو ہی نہیں بلکہ بیرون ہند کو بھی سیراب کر رہی ہے۔ آپ کا نورانی چہرہ ہم ظاہر بینوں کی نگاہ میں آپ کی روشن ضمیری کا بانگِ بلند اعلان کر رہا ہے۔ آپ کے سلوک و معرفت کے اعلیٰ ترین منصب کو تو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود بھی اہلِ دل ہو اور جسکا قلب بھی معرفت کے چراغ سے روشن ہو۔ ہم نا اہلوں کو اسکی کیا خبر؟ بس اتنا ہے کہ خدائے برتر کی توفیق سے آپ کو دیکھنے اور آپکی باتیں سننے کا زیادہ تر موقعہ اکل کوا میں اور ایک بار رنجنی میں ہوا ہے۔ مصافحہ کے بعد جانبین سے خیریت معلوم کی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ میرا نام بھی انھیں معلوم نہیں ہوگا اور نہ میری یاد کا کوئی گوشہ ان کے دل میں محفوظ ہوگا۔ یوں بھی دلوں میں لعل و گہر اور ہیرے جواہرات کا خیال باقی رہتا ہے اور سنگریزے حافظہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے۔ آپکی ذات سے جہاں ایک طرف اصلاح وارشاد کی مسند کو زینت مل رہی ہے وہیں دوسری طرف مسند تدریس بھی آپ کی ذات پر بجا طور پر فخر کر رہی ہے۔ جس طرح آپ تصوف و معرفت کے امام ہیں اسی طرح عربی فارسی اردو زبانوں پر کامل عبور رکھنے کے علاوہ جملہ علوم و فنون کے بحر مواج بھی ہیں۔ ہر علم و فن کی کتابوں کا درس مہارتِ تامہ کے ساتھ دینے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اسی طرح آپ وقیع ترین کتابوں کے لائق مصنف و شارح بھی ہیں جو درحقیقت آپکی عمیق علمیت اور فضل و کمال کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کا طریقۂ اصلاح وارشاد زمانۂ حال کی زیادہ تر مشیخت سے بالکل الگ ہے جہاں عالمانہ فضائل کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، لیکن آستان صدیقی پر سینکڑوں مرشدین کامل کی طرح علم و فضل کے سورج کی رہنمائی میں سلوک و معرفت کی راہوں پر چلنے اور چلانے کا طریقہ رائج ہے اور یہی تصوف کے منشور کا اصل ضابطہ ہے بنا بریں انھیں لوگوں کو یہاں کے طریقۂ کار اور اصلاح میں عجیب کشش محسوس ہوتی ہے جو علم کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور علم کی روشنی میں عمل کے جذبہ کے ساتھ اپنی اصلاح و تزکیۂ نفس کی خاطر آتے ہیں۔ بقیہ وہ لوگ جو تن آسانی اور سہل انگاری سے کام لینا چاہتے ہیں اور احکام شرع اور سنتوں پر عمل کے بجائے صرف کشف و کرامات اور خواب اور تعبیر ہائے خواب کو ہی اصل دین سمجھتے ہیں اور پیر صاحب کی دعاؤں پر تکیہ کر کے عمل کی مشقت اٹھانے کے خوگر نہیں بننا چاہتے ان کو یہاں بار نہیں مل سکتا۔ اور یقیناً وہ کبھی اپنی منزل پر پہنچ بھی نہیں سکتے شاید انھیں معلوم نہیں کہ ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ حضرت قاری صاحب مدظلہ کا تدریسی مشغلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے چنانچہ ایک عرصہ سے اپنے وطن ہتھورا ضلع باندہ یوپی میں اپنے ہی قائم کردہ مدرسہ میں حدیث وغیرہ کی تدریس میں مشغول ہیں اور باقی اوقات میں لوگوں کو راہ راست پر لانے کی خاطر اپنی تمامتر ذہنی قلبی اور جسمانی توانائیوں اور عزم جواں کیساتھ

(باقی صفحہ ۸۶ پر)

مولانا ناصر الدین مظاہری
نکھیم پوری

علم وعرفان کا
ایک اور آفتاب غروب ہو گیا

گذشتہ چند سالوں میں علماء دین اور صلحاء متین اس تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ ہمارے درمیان سے اٹھے ہیں کہ جنکے یاد آنے سے کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے قلب و ذہن پر ایک عجیب سی سنسنی چھا جاتی ہے جیسے ابھی کل ہی کی بات ہے کہ حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی کے نبیرہ حضرت مولانا حکیم عبدالرشید عرف نتھو میاں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے جسکا درد و غم رنج و الم برقرار ہی تھا کہ ادیب زماں حضرت مولانا وحید الزماں اللہ کو پیارے ہو گئے ابھی مولانا وحید الزماں کیرانوی کے سانحۂ وفات کا زخم تازہ ہی تھا کہ ملک کے مشہور و معروف عالم دین حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کی وفات حسرت آیات کا حادثہ پیش آگیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد مورخِ اسلام حضرت العلام مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی رحلت ہو گئی ابھی حضرت قاضی صاحب کی جدائی کے افسوس میں آنکھیں خشک بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ دنیا اسلام کے نامور فقیہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی کے انتقال پر ملال کی اطلاع مل گئی آہ! حضرت مفتی صاحب موصوف کی مبارک باتیں اور پاکیزہ نصیحتیں ذہن و دماغ میں محفوظ تھیں کہ حدیث و تفسیر اور تاریخ و سیر کے ماہر و نکتہ داں، خطیب و صحافی، ادیب واریب حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی روپوش ہو گئے ہم کیسے لکھیں کہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی عمدہ باتیں اور شستہ و شگفتہ تحریریں اور تقریریں دل و دماغ میں کچوکے لگا رہی تھیں کہ تبلیغی جماعت کے سب سے اہم اور آخری ستون، اکابر و اسلاف کی زندہ و جاوید یادگار حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان بزرگوں کی جدائیگی سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس پر پوری دنیا ماتم کناں تھی لیکن حیف! کہ دنیا والوں کی قسمت میں ابھی اور بھی افسوسناک اور دردناک واقعہ کا صدور لکھا تھا چنانچہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۶ء بروز جمعرات مشہور و معروف اور ہر دلعزیز عالم دین جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے فرزند، مناظر اسلام حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم کے خلیفۂ خاص، بقیۃ السلف عارف باللہ حضرت مولانا الحاج حافظ و قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نے کچھ عرصہ بیمار رہ کر لکھنؤ نرسنگ ہوم میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور

عمر بھر کے بے قرار کو قرار آگیا ہے

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا مشکل جو سب نظر آیا

نام ونسب اور ابتدائی تعلیم

آپ کا نام سید صدیق احمد تخلص ثاقب والد کا نام سید احمد قوم کے لحاظ سے سید رضوی اور پیشے کے لحاظ سے زمیندار تھے، دادا محترم کا اسم گرامی قاری عبدالرحمن باندوی (تلمیذ حضرت رأس المحدثین مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتیؒ) ہے، قاری صاحب کی ولادت سراپا رحمت اپنے ہی وطن مالوف ہتھورا ضلع باندہ میں ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور قرآن کریم کو اپنے جد محترم قاری عبدالرحمن صاحب سے حفظ فرمایا لیکن دوران تعلیم (حفظ) دادا کا انتقال ہوگیا تو باقی ماندہ حفظ قرآن کی تکمیل اپنے ماموں مولوی سید امین الدین صاحبؒ سے کی، حفظ اور مبتدی بچوں کے قواعد ورسائل پڑھنے کے بعد فارسی کی چند ابتدائی کتب پڑھیں اس کے بعد کانپور تشریف لے گئے جہاں عربی وفارسی کی ابتدائی کتابوں کی تکمیل مفتی سید احمد لکھنویؒ، مفتی صدر الدینؒ، مولانا کمال الدین اور مولانا سید سہراب علی نقشبندی (خلیفہ حضرت شاہ ہدایت علی نقشبندی جے پوریؒ) سے کی بعدہٗ پانی پت تشریف لے گئے اور شرح جامی بحث اسم تک تعلیم حاصل کی، اسی دوران سبعہ قراءت کی تکمیل میں کمال حاصل کرلیا شاطبیہ کا پہلا سبق اور اس کے مبادیات (قراءت سبعہ اور ان کے رواۃ کا نقشہ وغیرہ) حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحبؒ محدث پانی پتی کی پوتی سے پڑھا۔

مظاہر میں داخلہ

ہتھورا، کانپور اور پانی پت میں ابتدائی عربی وفارسی کی تکمیل کے بعد شوال میں مرکز علم وعرفان جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تشریف لائے اور حضرت مولانا سید ظہور الحق صاحب دیوبندیؒ (جو نہایت بزرگ، متقی، پرہیزگار اور محتاط تھے) نے داخلہ امتحان لیا، دوران امتحان علامہ ابن حاجبؒ کی مشہور کتاب کافیہ سے تین سوالات کئے تو قاری صاحب موصوف نے دو جوابات بالکل صحیح دیئے اس کے بعد مولانا دیوبندیؒ نے فارم داخلہ کے نقشہ جات پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ اور فارم پر "سید" لکھا دیکھ کر فرمایا "سید ہو؟" پھر فرمایا "سید پڑھے اچھا ورنہ مرے اچھا"، مشفق استاذ کے یہ ناصحانہ کلمات بابرکات سن کر مولانا باندویؒ پر رقت طاری ہوگئی، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور مولانا دیوبندی سے عرض کیا کہ "حضرت اچھا پڑھنے کا وعدہ کرتا ہوں اور اچھی موت کی دعا فرمادیجئے"، ایک متوسط طالب علم کا یہ سعادتمندانہ جواب سنکر حضرت مولانا دیوبندیؒ نے فرمایا

"اگر محنت سے پڑھو گے تو میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنے وقت کا علامہ صدیق بنادیں گے"

اس کے بعد امتحان داخلہ میں پاس فرمادیا اور
شنبہ ۱۵ شوال المکرم ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۷ نومبر ۱۹۳۹ء
داخلہ ہوگیا ۱۳۵۹ھ میں اصول الشاشی، میرقطبی، کنزالدقائق،
ث اسم، سلم العلوم، تلخیص المفتاح ۱۳۶۰ھ میں مقامات
یری، شرح وقایہ، نورالانوار، سبعہ معلقہ، مختصر المعانی
ر ۱۳۶۱ھ میں جلالین شریف، ہدایہ اولین، میبذی،
شیدیہ، تاریخ الخلفاء، ۱۳۶۲ھ میں بیضاوی شریف،
یہ اولین، مشکوٰۃ شریف، مقدمہ مشکوٰۃ شریف، شرح
ۃ الفکر پڑھ کر ۱۳۶۳ھ میں دورۂ حدیث شریف میں داخل
ئے اور بخاری شریف جلد اوّل، ابوداؤد شریف حضرت
لانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے، مسلم شریف حضرت
لانا منظور احمد خاں صاحبؒ سے، بخاری شریف جلد ثانی
تاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب پورقاضویؒ
ے، ترمذی شریف، شمائل ترمذی اور طحاوی شریف
حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری سے اور نسائی شریف
ن ماجہ شریف، مؤطا امام مالکؒ اور مؤطا امام محمدؒ مناظر
سلام حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب رام پوری سے
ھنا شروع کیا لیکن بعض مصالح کی بنا پر ۱۳۶۳ھ میں
ماہی کے وقت مدرسہ امینیہ دہلی تشریف لے گئے
ہاں حضرت مولانا و علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ صدر
مدرسین اور شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز تھے، سے
خاری شریف اور دیگر اسباق کی تکمیل کرکے باقاعدہ
اغت اور سند فضیلت حاصل فرمائی۔

جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تقریباً ۵ سال طالب علمی
کی حیثیت سے پڑھتے رہے، دورۂ حدیث شریف کے خصوصی
رفقاء میں مولانا محمد ثانی ندوی مظاہری، مولانا عبدالقدوس
رومیؒ، مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری اور مولانا محمد وجیہ
ٹانڈوی قابلِ ذکر ہیں۔

مظاہر علوم میں ۱۳۵۸ھ سے ۱۳۶۳ھ تک حضرت
مولانا قاری سعید احمد صاحب اجراڑوی، مولانا و علامہ
صدیق احمد کشمیریؒ، علامہ امیر احمد کاندھلوی، مولانا عبدالشکور
کامل پوریؒ، مفتی جمیل احمد تھانویؒ اور مولانا مفتی محمود حسن
گنگوہیؒ سے بھی پڑھنے اور استفادہ کا موقع ملا۔

بیعت وخلافت

حضرت مولانا سید صدیق احمد باندویؒ کو اللہ رب العزت
نے بچپن سے ہی بزرگ صفت، فرشتہ صورت، نیک
عادات و اطوار اور محتاط بنایا تھا، چنانچہ طالب علمی
کے دور میں ہی آپ اپنی بے مثالی خوبیوں اور خصوصیتوں
کی بنا پر مشہور ہوچکے تھے اور اس دور کے اکابر و مشائخ
کے خاص منظورِ نظر بھی۔ اس کے علاوہ خود قاری صاحبؒ
موصوف زمانہ طالب علمی میں مولانا حضرتؒ مولانا سید
ظہور الحق صاحب دیوبندیؒ، مناظر اسلام حضرت مولانا
محمد اسعد اللہ صاحب رام پوریؒ اور شیخ الحدیث مولانا
محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کی خاص طور پر خدمت کرتے
تھے، چنانچہ ان بزرگوں کی دعاؤں سے قاری صاحبؒ میں
بعض ایسی خوبیاں پیدا ہوچکی تھیں جنہیں دیکھ کر ان کے
مستقبل کے روشن اور تابناک ہونے کا پتہ چلتا تھا،
چنانچہ مزید روحانی خوبیوں کو اجاگر کرنے کیلئے حکیم الامت

مجدد الملّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ
مرقدہٗ کے آستانہ پر دستک دی اور بیعت کی درخواست
کی تو حضرت تھانوی نے ازراہِ شفقت وعنایت فرمایا کہ
"میرے خلفاء ومجازین میں سے جس کے ساتھ زیادہ مناسبت
محسوس ہو تعلق قائم کرلیا جائے"، چنانچہ واپس مظاہر علوم
تشریف لائے اور حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ خاص مناظر اسلام
حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ رام پوری ناظم مظاہر علوم
سہارنپور سے ۲۵ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ مطابق ۳۱ اکتوبر
۱۹۵۶ء بروز چہارشنبہ ۱۰ بجے دن کو مسجد کلثومیہ
(دارالطلبہ قدیم مظاہر علوم وقف کی مسجد) میں بعمر ۲۱ سال
بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔

حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ اپنی یادداشت
میں لکھتے ہیں:-

"(۳) دن کے دس بجے مسجد کلثومیہ یوم چہارشنبہ
۲۵ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء عزیز
محترم صدیق احمد سلمہ اللہ تعالیٰ کو اجازت بیعت
وتلقین دی گئی"۔ محمد اسعد اللہ

مقامات تدریس

فراغت کے بعد درس وتدریس
کا مشغلہ اختیار فرمایا اور تین
سال مدرسہ اسلامیہ فتح پور ہنسوہ تدریسی خدمت انجام
دی جہاں حضرت مولانا عبد الوحید صاحب صدیقی فتحپوری
تلمیذ خاص مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی صدر المدرسین تھے
اور حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ اور محی السنۃ حضرت
مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی مدظلہٗ بھی مدرس رہ چکے
تھے اسی دوران کچھ عرصہ مدرسہ فرقانیہ ضلع گونڈہ میں بھی
درس دیا، اس کے بعد مستقل مدرسہ قائم کرنے کا خیال ہو
تو اپنے وطن ہتھورا ضلع باندہ میں ایک مکتب کی بنیاد
رکھدی لیکن معلوم تھا کہ یہ مکتب کبھی عظیم دینی وملی اور
اسلامی چھاؤنی بن جائے گا اور اسلام کی صداقت وحقانیت
کا علمبردار بنکر دنیا میں چمکے گا اور صرف ہندوستان ہی نہیں
بیرون ملک میں بھی اپنی خوبیوں کی شہرت مچادے گا اور
شائقین علوم نبوت وطالبین علوم رسالت پروانہ وار آکر
اپنی علمی تشنگی کو بجھائیں گے۔

حضرت مولانا موصوف نے ایک ایسے وقت میں
بدعت زدہ اور ظلمت خانہ میں علم کا چراغ جلایا تھا جہ
بدعات وخرافات، الحاد ودہریت، ارتداد ولادینیت
جہالت وشقاوت اور تعزیہ داری کا عروج تھا، شیطان
کی چالاکیوں اور عیاریوں کے فریب میں آکر مسلمانو
کا ایک بڑا طبقہ زندیق، ملحد اور مرتد ہوچکا تھا اسلا
کی صداقت وحقانیت اور اسکی عظمت وحقیقت سے
لاعلم ان جاہلوں میں دین واسلام کی صداقت اور قرآ
وسنت کی ترویج واشاعت بڑے دل گردے کا کام
تھا، ایک طرف آپ کی ذات بابرکت تھی تو دوسری
طرف کفر والحاد اور شرک وبت پرستی کا زور، ارتدا
اور اختلاف کا شور، جہالت وضلالت کے اندھیر
لیکن حضرت قاری صاحب موصوفؒ نے ہمت نہ ہار
اور آپکے عزم وہمت اور حوصلے میں پختگی کیساتھ د
کی خدمت اور اسلام کی حفاظت وصیانت کی فکر جو

اری رہی چنانچہ ایک طرف، تو آپنے کفر و ارتداد کے
لاف آواز بلند فرمائی دوسری طرف تعلیم و تعلم کیلئے
رس کو چلایا اور اسکے ساتھ ساتھ دین و اسلام پر ہونے
لے اعتراضات اور مرتدین کے نئے نئے اشکالات
تشفی بخش جواب دیتے رہے، بدعات و خرافات کے
لاف بھی آپنے آواز اٹھائی اور جاہلانہ و عامیانہ رسوم
ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا غرض آپ کی بے پناہ
نتیں اور کوششیں رنگ لائیں اور جو لوگ اسلام
ے منحرف و مرتد ہوگئے تھے وہ دوبارہ اسلام میں
اخل ہوئے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جماعت تبلیغی سے لگاؤ

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تبلیغی جماعت سے خاص تعلق، دلی انسیت
اور بہت زیادہ لگاؤ تھا، چنانچہ ۱۳۶۲ھ اور ۱۳۶۵ھ
یں آپ مسلسل جماعت میں رہے اور دینی خدمت و
نت کیلئے دور دراز کے اسفار طے کئے پھر اپنے علاقہ
یں تبلیغ کی جو نمایاں خدمات انجام دیں کہ آج آپکے
رب و جوار میں جو دینی رنگ اور عوام و خواص تبلیغی
جماعت سے ہم آہنگ ہیں اسکا سہرا آپ ہی کے سر جاتا
ہے نیز باندہ اور اس کے مضافات میں جہاں دینی
جلاس نہیں ہوتے تھے وہاں اجلاس کرائے اور ہمیشہ
تبلیغی جد و جہد میں لگے رہے۔

مدارس دینیہ کی تاسیس

قاری صاحب موصوف نے دین و اسلام کی ہر طریقے پر خدمت انجام دی ہے چنانچہ تہذیب و تمدن
کے عروج و ارتقاء میں "علم" کا سب سے بڑا ہاتھ ہوتا ہے
اس لئے قاری صاحبؒ نے خاص طور پر دینی علم کی ترویج
و اشاعت کیطرف رجحان دیا کیونکہ ان مدارس سے کفار
و فجار سے مقابلہ کیلئے فوج بھی تیار ہوگی اور قرآن و سنت
کی روشنی میں صالح معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں بھی حصہ لیں گے
چنانچہ ۲۰ درجن سے زائد عربی اور اسلامی مدارس و مکاتب
کو اپنے متبرک ہاتھوں سے قائم فرمایا اور ان گنت انجمنوں،
اکیڈمیوں، دینی تحریکوں اور مسجدوں کو وجود بخشا اور
سرپرستی فرمائی چنانچہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ
العلماء لکھنؤ وغیرہ کی مجلس شوریٰ کے رکن و نگراں بھی
رہے اور مدرسہ امداد العلوم زید پور، مدرسہ دارالرشاد بنکی
بارہ بنکی، انوار العلوم الہ آباد، نور العلوم کھیم پور
اور اشرف العلوم کھیم پور وغیرہ متعدد دینی اداروں
کی سرپرستی بھی فرمائی۔

قاری صاحب موصوف اپنے مرشد کی نظر میں

مولانا باندوی جس طرح علم کی تعلیم و تحصیل
اسباق کی حاضری، تکرار و مطالعہ پر مداومت، اور مطالعہ
و تحقیق کا ذوق رکھتے تھے اسی طرح اکابر کی خدمت میں
بھی بہت دلچسپی لیتے تھے چنانچہ حضرت مولانا سید
ظہور الحق صاحبؒ کی خدمت کا بہت موقع ملا، اس کے

علاوہ مناظر اسلام حضرت مولانا شاہ محمد اسعد اللہ صاحبؒ
کی خدمت میں خاص طور پر رہے لیکن مولانا موصوفؒ
آج کل کے نام نہاد خادموں کی طرح نہیں تھے جو بزرگوں
کی خدمت کا کم اپنے ذاتی مفاد کا زیادہ خیال رکھتے ہیں
مولانا باندویؒ خدمت کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے
علوم ومعارف سے بھی مستفید ہوتے رہے مجالس میں
بالاستیعاب حاضری، الجھے ہوئے سوالات کا حل،
دقیق اور ادق مضامین کے متعلق استفسار غرض اپنی
روحانی تعمیر وتربیت کا بھی خوب خیال رکھا تھا، پھر
مولانا محمد اسعد اللہ صاحب کی جس پر نظر کرم ہو اسکا
"کندن" ہوجانا بعید نہیں اور جو مرید اپنے مرشد کے
نظر میں محترم ومعظم اور لائق اکرام واحترام ہو اسکا
کیا مقام ومرتبہ ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ مولانا محمد
اسعد اللہ صاحبؒ کے اس قول سے ہوسکتا ہے کہ

"اگر کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے دریافت
فرمایا کہ کیا لائے ہو تو میں حافظ صدیق کو پیش کردونگا"

زہد وقناعت

اللہ کے مقرب بندے صبر وضبط
تحمل وبردباری، عفو ودرگذر،
خوف وخشیت، تقویٰ وتقدس، خاکساری ومسکنت،
استغنا وبے نیازی اور زہد وقناعت میں بے مثال
وبے نظیر ہوتے ہیں اور امانت داری، وفا شعاری،
وعدے کے پکے، قول کے سچے بھی حضرت مولانا قاری
صدیق احمد صاحب باندویؒ مذکورہ بالا تمام صفات و
خصوصیات سے بدرجہ اتم مالامال تھے، چنانچہ زہد وقناعت
کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ہمیشہ تنگی وعسرت کی زندگی گذار
اور کبھی بھی ایک حرف شکایت زبان پر نہ لائے. سادگ
نفاست اور مسکنت پسندی آپ کا طرۂ امتیاز تھا
آپ نے سادہ زندگی کو ہی اختیار فرمایا، دولت وثروت
آئی تو آپ نے فوراً غربا ومساکین اور نادار طلبا، او
مدرسہ پر خرچ فرمادیا چنانچہ ایک رئیس نے ایک خطی
رقم یہ کہکر آپ کو ہدیہ پیش کی کہ "اپنی ذاتی گاڑی خر
لیجیے اس پر سفر کریں" لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ موصو
نے وہ رقم مدرسہ کو سونپ دی اور روتے ہوئے فرمایا:

"اگر آج میں نے اپنی گاڑی خریدلی تو دنیا
والے انگلی اٹھائیں گے کہ صدیق نے مدرسہ
کی رقم سے اپنی گاڑی خریدلی ہے"

صبر واستقامت

آلام ومصائب اور ابتلا
وآزمائش سے آپ کو گذر
پڑا، صبر آزما اور جان لیوا حالات سے نبرد آزما ہو
ظالموں کے ظلم، حاسدوں کے حسد اور دشمنوں کی عداو
وشقاوت کو برداشت کیا لیکن ہمیشہ خندہ پیشانی س
تمام ناخوشگواریوں کو برداشت فرمایا خود آپ ک
یہ اشعار کتنے پُر درد وپُر اثر ہیں ؎

غلام بنکر جو جی رہے تھے، اماں دلائی تھی جنکو ہم نے
صلہ وہ ہمکو یہ دے رہے ہیں، غلام اپنا بنا رہے ہیں
یہ ظالموں کا ستم تو دیکھو، ہمارا اس پر یہ صبر دیکھو
ہمارے گھر کو وہ کرکے ویراں، اپنی بستی بسا رہے ہیں

بچائی تھی ہم نے جنکی جانیں وہ جنکے بچوں کو ہم نے پالا
وہ خون ہمارا بہار ہے ہیں ہمارے بچے جلا رہے ہیں
نہیں ستایا ہے جنکو ہم نے گلے لگایا ہے جنکو ہم نے
وہ بنے دشمن ہماری گردن پہ، آج چھریاں چلا رہے ہیں

عبادت و ریاضت

قاری صاحبؒ مدرسہ کے انتظامی معاملات کی مصروفیتوں، ملک و بیرون ملک کے تبلیغی و تشریعی اسفار اور مواعظ و بیان کے ہماہمی کے باوجود عبادت و ریاضت میں بھی درجۂ کمال رکھتے تھے، چنانچہ جب بھی موقع ملا اور متعلقین و منتسبین، واردین اور صادرین سے فرصت ملی تو آپ عبادت میں مشغول ہوگئے، چنانچہ آپ کے شیخ و مرشد اور استاذ خصوصی حضرت مولانا شاہ محمد اسعد اللہ صاحبؒ کو ایک خطرناک بیماری لگ گئی جس کی اطلاع فوری طور پر قاری صاحبؒ کو بھیجی گئی چنانچہ اپنے شیخ کی بیماری کا حال سنکر تڑپ اٹھے اور دوسرے دن سہارنپور تشریف لائے اور اپنے شیخ کی عیادت و تیمارداری اور ہمہ وقت حاضری پھر اسپتال کی جگہ پر واردین و صادرین اور عیادت کرنے والوں کا اژدحام ان تمام رکاوٹوں اور پریشانیوں کے باوجود اپنے اوقات کی پابندی، معمولات پر مداومت اور عبادت و ریاضت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا یعنی شاہدین کے مطابق قاری صدیق احمد صاحبؒ کا مصلیٰ اسپتال کے ایک گوشے میں بچھا رہتا تھا اور وقت ملنے پر نماز و نوافل اور ذکر و اذکار میں مشغول رہتے اور ساتھ ساتھ اپنے شیخ و مرشد کی آرام و راحت کیلئے خود کو وقف رکھتے تھے۔

دعاؤں کی قبولیت

مناظر اسلام حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ کو بغرض علاج چشم سیتاپور اسپتال جانا ہوا ساتھ میں دیگر متعلقین کے علاوہ قاری صدیق احمد صاحبؒ بھی تھے چنانچہ وہاں مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کی طبیعت دگرگوں ہونے لگی اور کھانسی تیز ہوگئی تو قاری صاحبؒ سے فرمایا کہ "حافظ صاحب! کچھ پڑھ کر دم کردو" اپنے پیر و مرشد کا یہ حکم سنکر قاری صاحب نے کچھ پڑھکر دم کردیا اسی وقت اللہ کے فضل و کرم سے افاقہ ہوگیا، اس طرح بہت سے ضرورت مند حضرات آپ سے دعا کرانے کیلئے دور دراز مقامات سے آتے تھے اور حضرت قاری صاحبؒ سے اپنے جائز امور و مشکلات کے بہتر حل کی دعا کراتے تھے اور اللہ تبارک و تعالیٰ قاری صاحب کی دعاؤں کو قبول فرمالیتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ موصوف اپنے وقت کے مستجاب الدعوات تھے۔

مقبولیت خاص و عام

اللہ رب العزت نے آپ کو علم و اخلاق کا ایسا شریف و حلیم اور بردبار بنایا تھا کہ جس نے بھی آپ کو دیکھ لیا اور گفتگو کا موقع مل گیا وہ آپ ہی کا ہوکر رہ گیا چنانچہ عالم اسلام میں آپ کو جو بے پناہ مقبولیت اور خلق خدا میں مرجعیت نصیب ہوئی احقر کی ان آنکھوں نے اتنا مقبول اور ہر دل عزیز نہیں دیکھا، آپ کو مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی تمام مذاہب و ادیان کے لوگ مانتے تھے اور ہندو وغیرہ تو آپکو اوتار سمجھتے تھے چنانچہ

باندہ بھر کے ہندؤں اور غیر مسلموں میں آپ کو" بابا" سے یاد کیا جاتا تھا اور سب ہی آپ کا اکرام و احترام کرتے تھے، اپنی گاڑیوں اور مکانوں کے افتتاح کیلئے خواہشمند رہتے تھے، ریلوے حکام اور عملہ بھی آپ کا بہت ادب کرتا تھا چنانچہ آج کیوجہ سے گاڑی (ٹرین) کو روک دینا بہت معنیٰ رکھتا ہے۔

علوم وفنون پر مہارت

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ہم گذشتہ صفحات میں حضرت مولانا ظہور الحق صاحب دیوبندیؒ کا وہ یادگار تاریخی قول نقل کر چکے ہیں۔ جو قاری صاحبؒ کا امتحان لیتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ

"اگر محنت سے پڑھوگے تو میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنے وقت کا علامہ صدیق بنادیں گے"

مولانا دیوبندیؒ کی یہ پیشینگوئی حرف بحرف ثابت ہوئی اور آپ واقعی اپنے دور کے علامہ وقت اور فہامۂ دوراں بنکر دنیا دنیا میں چمکے چنانچہ فراغت کے بعد سے وفات کے سال تک تقریباً ہر سال شرح جامی کا درس دیا اور اپنے استاذ امام النحو علامہ صدیق احمد کشمیریؒ فاروقی کے واقعی جانشین ثابت ہوئے اور علامہ صدیق کہلائے، اسکے علاوہ مختلف علوم و فنون کے نصف درجن سے زائد اسباق آپ کے ذمہ تھے جنمیں بخاری اور شرح جامی بھی شامل ہیں، اللہ کا فضل و کرم اور آپ کے اوقات میں برکت کا یہ عالم تھا کہ باوجود کثیر اسفار اور بے پناہ مصروفیات کے ہر کتاب کو کما حقہٗ پڑھا کر وقت مقررہ پر ختم فرماتے تھے، تفسیر و حدیث، فقہ و اصول فقہ، منطق، صرف و نحو، فصاحت و بلاغت، فلسفہ و حکمت اور دیگر علوم و فنون کے خاص مضامین، چیدہ و پیچیدہ ادق اور مشکل عبارات کا استحضار اور مختلف کتابوں کے حوالجات کی یادداشت اتنی پختہ تھی کہ رشک آتا تھا، مدرسہ کے اساتذہ و طلباء کی فہم سے بالاتر سخت مسائل کو آپ چٹکیوں میں حل فرمادیتے تھے، یہ مقام و مرتبہ شاید مولانا سید ظہور الحق صاحب کی پیشینگوئی اور اساتذہ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

کاغذات کا احترام

حضرت قاری صاحبؒ یوں تو دین و اسلام کے تمام ارکان اور اقسام کی عظمت اور ان کے اکرام و احترام میں بے مثال شخصیت رکھتے تھے اسکے ساتھ ساتھ آپ کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ تھا کہ اگر کہیں کاغذ کا ٹکڑا پڑا دیکھ لیا تو فوراً اٹھا کر کسی محفوظ و مامون جگہ پر رکھدیتے تھے اور کبھی کبھی غلبۂ حال میں تو یہاں تک فرمادیتے کہ "بچو! ان کاغذوں کے ٹکڑوں کو اٹھا کر محفوظ جگہ میں رکھ دیا کرو کل قیامت کے دن جب کوئی دشواری پیش آئے تو میرا دامن پکڑ لینا" حضرت کا یہ معمول اسقدر دائمی تھا کہ بعض ضروری کاموں کو چھوڑ کر اس عارضی کام کو انجام دیتے تھے یہی حال آپ کے

استاذ، صاحب جذب و کرامات حضرت مولانا محمد ظریف صاحبؒ پورقاضوی استاذ مظاہر علوم کا تھا۔

مسواک کی پابندی

آپ کے معمولات میں سے ایک معمول بلاناغہ مسواک کرنے کا تھا چنانچہ آپ ہر نماز اور وضو کے وقت مسواک ضرور فرمایا کرتے تھے اور اپنی مجلسوں، اسباق اور وعظوں میں متعدد مرتبہ مسواک کے فضائل و مسائل بیان کرکے عوام و خواص کو اسکی تلقین فرماتے تھے۔

شاعری کا ذوق

قاری صاحبؒ کو شعر و شاعری کا بھی ذوق اور شوق تھا آپکی شاعری حمد و نعت، مدح اور مرثیہ پر مشتمل ہوتی تھی بڑی پُردرد شاعری اور نظم پروری میں کمال رکھتے تھے ہاں آپ تلمیذ رحمان تھے، اپنا تخلص ثاقبؔ رکھتے تھے بعضے اشعار اس قدر وجد آفریں اور پر اثر ہیں کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، آپکی شاعری آجکل کے پیشہ ور شعراء کی طرح نہیں تھی آپ کا یہ شعر کتنا پُردرد ہے ؎

جو پہنچا حشر میں ثاقبؔ فرشتے سب پکار اٹھے
محمدؐ کے غلاموں کے غلام کا غلام آیا

اور ایک موقع پر فرمایا ؎

سوادِ گلشن کی یہ حقیقت یہاں بہاہے لہو ہمارا
ستم ظریفی یہ ان کی دیکھو چمن وہ اپنا بنارہے ہیں
نکالنے کو وہ اپنا مطلب کبھی تو کہتے ہیں ہم کو بھائی
ہمارے گھر کے دیے بجھا کر وہ اپنی شمعیں جلارہے ہیں

ہمارے دشمن ستارہے ہیں ہم کو وہ جتنے چاہیں دبائیں ہم کو
مگر وہ روئیں گے روز محشر جو آج ہم کو رلا رہے ہیں
کسی کا اسمیں ہے کیا اجارہ، خدا کے ہم ہیں خدا ہمارا
ستم جو اب تک ہوئے ہیں ہم پر خدا کو اپنے سنارہے ہیں
کلام پر درد ہے یہ کتنا، سنارہے ہیں ہمیں جو ثاقبؔ
سبھی کو دیکھو رلا رہے ہیں وہ خود بھی آنسو بہارہے ہیں

قلمی کارنامے

موصوفؒ جسطرح میدان تعلیم کے ماہر و یکتا تھے اسیطرح تصنیف و تالیف میں بھی کمال رکھتے تھے چنانچہ ایک درجن سے زائد علمی و اصلاحی کتب تصنیف فرمائیں جن میں تسہیل التجوید، احکام المیت، تسہیل الصرف، اسعاد الفہوم شرح سلم العلوم، فضائل نکاح، حق نما، آداب المتعلمین، تسہیل المنطق، فضائل علم خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔

مادر علمی سے والہانہ تعلق

جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے آپ کو پوری عمر جو لگاؤ اور تعلق رہا وہ اپنی مثال آپ ہے، شاید ہی کوئی ایسا سال گذرا ہو جسمیں موصوف سہارنپور اگر مادر علمی نہ آئے ہوں چنانچہ مظاہر علوم کے ناظم اعلیٰ فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم ایک دعوتی سفر پر مظفر نگر کے موضع نردھنہ میں ۳۰ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۴ر نومبر ۱۹۹۳ء بروز جمعرات بوقت شام تشریف لے گئے، رات میں جب تہجد کیلئے اٹھے تو وضو کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے پیر پھسل گیا اور آپ گرگئے سر میں شدید چوٹ آئی اور دماغ کی ۲ رگیں کافی متاثر

ہوگئیں، یہ حادثہ اپنی نوعیت کا زبردست اور افسوسناک واقعہ تھا، چنانچہ ہندوستان کے طول وعرض پر پھیلے ہوئے مریدین و متعلقین، مدرسہ کے بہی خواہ اور مخیر و منتسبین بے چین ہوگئے اور جس نے جب اور جہاں یہ افسوسناک خبر سنی فوراً عیادت ضروری سمجھی چنانچہ دیگر اکابرین و معتقدین کے علاوہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحبؒ بھی بغرض عیادت تشریف لائے، پھر ۱۱ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۹۵ء کو سہارنپور تشریف لائے اور مظاہر علوم کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سے ملاقات فرمائی اور کچھ ہدیہ بھی پیش کیا، پھر ۲۷ مئی ۱۹۹۶ء کو دوبارہ تشریف لائے اور اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ کے مزار اقدس پر جاکر فاتحہ خوانی کی اسکے بعد مفتی صاحب مدظلہ سے ملاقات فرمائی، آنے جانے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور جب بھی آتے تو اپنے رفقاء، بالخصوص مفتی مظفر حسین صاحب، مفتی محمد یحییٰ صاحب، مولانا محمد یونس صاحب، مولانا انعام الرحمان صاحب تھانوی، مولانا امداد اللہ صاحب سہارنپوری سے ملاقات کرتے۔

حضرت قاری صاحب کا آخری سفر جو سہارنپور کے لئے ہوا وہ ۴ صفر المظفر ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۹۶ء بروز چہارشنبہ ہے، اس سفر میں بھی اپنی مادر علمی کو قدوم میمنت سے نوازا اور مفتی صاحب مدظلہ سے ملاقات فرمائی۔ آہ! کیا معلوم تھا کہ حضرت کا یہ سفر آخری ہے اور اسکے بعد حضرت کے دیدار سے ہمیشہ کیلئے محروم ہونا پڑے گا ؂

پھر مری گرد کو بھی پا نہ سکے گی دنیا
جسکو دل سے مرا بننا ہو وہ اب بن جائے

موصوف آخری عمر میں ضعف و نقاہت، کمزوری و معذوری اور مختلف الاقسام کی اسقام و آلام میں گرفتار ہوگئے لیکن —— بیماریوں اور معذوریوں کا یہ سلسلہ اتنا زبردست اور خطرناک ثابت ہوگا اس کا وہم بھی نہ ہوا تھا ؂

اب کیا ستائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں
اب ہم حدود سود و زیاں سے گذر گئے

وفات حسرت آیات

پیرانہ سالی کی بنا پر مختلف بیماریوں کا شکار ہوگئے تھے، وفات سے کچھ یوم قبل فالج میں مبتلا ہوگئے چنانچہ نرسنگ ہوم لکھنؤ میں لیجایا گیا لیکن افسوس! کہ عمر نے وفا نہ کیا اور ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۶ء بروز پنجشنبہ بوقت صبح دس بجکر ۲۵ منٹ پر آسمان علم و فضل کا وہ آفتاب جہاں تاب جو ۱۹۲۶ء کو ظلمت کی تاریکیوں میں شعلۂ نور بنکر ہویدا ہوا تھا لکھنؤ نرسنگ ہوم میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا ؂

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت قاری صاحب کے انتقال پُر ملال کی افسوسناک خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور انتقال کے نصف گھنٹے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

سے فون پر یہ جانکاہ خبر آئی کہ "مظاہر علوم کا ایک عظیم سپوت اور اسلام کی برگزیدہ ہستی حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحلت فرما گئے" اس نوعیت کی یہ ایسی خبر تھی کہ جسکو معلوم ہوا کلیجہ تھام لیا، آنکھیں اشکبار اور قلوب مضطرب و بے قرار ہو گئے، ایک مٹنے والا سکوت، نہ ختم ہونے والا صدمہ — اور نہ بھولنے والا حسرتناک حادثہ ہے

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

آپ کے انتقال کی خبر کلفت اثر پر یقین نہیں آرہا تھا، دل و دماغ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ عالم اسلام کی ایسی برگزیدہ ہستی اتنی جلد ہمارے درمیان سے رخصت ہو جائے گی اور ہم ان کو ڈھونڈتے ہی رہیں گے ؂

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جسکی حسرت و غم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم!

چنانچہ مزید تصدیق کیلئے دوبارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء فون کیا گیا تو جواب میں وہی افسوسناک خبر، وہی دلدوز واقعہ کی تائید — لیکن پھر بھی ذہن ماننے کو تیار نہ تھا، کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا چنانچہ حضرت کے مدرسہ عربیہ ہتھورا باندہ سے فون پر رابطہ قائم کیا گیا، وہاں سے بھی اسکی تصدیق ہو گئی۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا جب انتقال ہوا اسوقت دارالعلوم دیوبند میں شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا حضرت تھانویؒ کی رحلت کی خبر پاتے ہی وہ اجلاس مؤخر کر دیا گیا تھا، بعینہٖ وہی صورت حال مظاہر علوم وقف کے ساتھ پیش آئی کہ مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا جسمیں صاحبزادہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی عبد القدوس صاحب رومی مفتی شہر آگرہ، حضرت مولانا مفتی عبد القیوم صاحب رائپوری حضرت مولانا عبد اللہ صاحب مغیثی ابراڑوی اور فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم شریک تھے، اس افسوسناک خبر کے آتے ہی اجلاس مؤخر کر دیا گیا اور مظاہر علوم وقف میں قرآن کریم پڑھوا کر ایصال ثواب کیا گیا۔ پھر حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نے بذریعہ فون تعزیت فرمائی۔

حضرت قاری صاحبؒ کی نماز جنازہ ہتھورا ضلع باندہ میں عشاء کے وقت آپ کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ صاحب مدظلہ نے پڑھائی، نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز بتائی جاتی ہے ؂

آہ اشکوں کو نہ ان کا ہو سکا دامن نصیب
دفن ہم نے خاک میں ہر اک ستارہ کر دیا

اللہ تبارک و تعالیٰ مولانا موصوف کو کروٹ کروٹ چین و سکون عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشے ؂

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

قاری وسیم احمد صاحب بارہ بنکوی
خادم القرآن جامعہ عربیہ ھتورا باندہ، یوپی

آہ

حضرت اقدس مولانا سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

حضرت کی وفات مدرسہ، مسلمانوں، ملک کے لئے نہیں بلکہ عالم اسلام کیلئے ایسا خلا ہے جو پُر کرنا فی الحال ناممکن ہے ۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

آپ کی ولادت انیس سو پچیس (۱۹۲۵) کے قریب ہے، اور جائے پیدائش ھتورا ضلع باندہ یوپی.......

آپکے والد بزرگوار جناب سید احمد صاحبؒ تو کافی صغر سنی میں وفات پاگئے تھے. اس لئے آپ کی سرپرستی جناب قاری عبد الرحمن صاحبؒ نے کی جو محدث پانی پتی جناب قاری عبد الرحمن صاحبؒ کے فیض وتربیت یافتہ تھے. حضرت کی عمر جب آٹھ سال کی ہوئی، ان کا بھی سایہ سر سے اٹھ گیا. اب والدہ ماجدہ، اور چچا، ماموں کا ہی سایہ اور شفقتیں رہ گئیں. آپ کا علمی وتربیتی سفر جو انھوں نے شروع کرایا تھا وہ بعد میں بھی جاری رہا حتیٰ کہ آپ تکمیل وتدریس کے مرحلہ تک پہونچ گئے. حضرت نے ابتدائی تعلیم جد بزرگوار کے علاوہ مولانا امین الدین صاحب سے حاصل کی. اس کے ساتھ کانپور مدرسہ جامع العلوم اور مدرسہ تکمیل العلوم اس کے بعد آپ اجمیر شریف تشریف لے گئے، وہاں مدرسہ مولانا معین الدین صاحب اجمیری، اس کے بعد پانی پت مدرسہ قاری عبد الرحمن صاحب، مظاہر علوم سہارنپور، دھلی مدرسہ فتحپوری، مراد آباد شاہی وغیرہ میں چند سال کا عرصہ گذار کر کے دورۂ حدیث شریف کی تعلیم وفراغت مدرسہ مظاہر علوم سے ہوئی اور خصوصی دلچسپی کے بنا پر معقولات کی مزید تعلیم کیلئے جامع العلوم مظفر پور بہار میں چند ماہ کا قیام فرمایا، اس کے بعد تدریسی زندگی کا سلسلہ شروع ہوا.....

چند ماہ گونڈہ مدرسہ فرقانیہ اور چند سال فتحپور مدرسہ اسلامیہ میں تدریسی فرائض انجام دی. بالآخر وطن و علاقے کے مسلمانوں کے بگڑے ہوئے ماحول نے مجبور کیا کہ وطن کو اپنی دینی خدمت کا مرکز بنایا جائے اسی عزم کے ساتھ فتحپور چھوڑا چونکہ علاقے کے مسلمانوں میں کفر والحاد کا زخم بھی ناسور بنتا جارہا تھا اسلئے بالآخر حضرت کی سوزشِ قلب اور خلوص نیت کے نتیجے میں قدرت کے فیصلے کا ظہور یوں ہوا کہ اچانک مدرسہ کی صورت پیدا ہوگئی جسکا آغاز چند مبتدی وصغیر السن طلباء اور گاؤں کی مسجد و چوپال سے ہوا. بیسیوں سال فقروفاق

کی زندگی رہی اور مدرسہ کے فرائض انجام دیتے رہے اور یہاں سے کچھ نہ لیا آج جب کہ جامعہ نے اپنی عمر کی چار دہائیاں پوری کرلیں سینکڑوں طلبا، عظیم الشان عمارتوں کے زیر سایہ علم ومعرفت کی پیاس بجھارہے ہیں حضرت نے اپنا علمی سفر بڑی قربانیوں وجانفشانیوں کے ساتھ شروع اور طے فرمایا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے علوم عالیہ وعلوم آلیہ دونوں میں کمال عطا فرمایا، اور آغاز تدریس سے ہی دونوں قسم کے علوم کی اہم و انتہائی کتابیں زیر تدریس رہیں۔ علوم آلیہ کی بعض اہم کتابوں سے خصوصی دلچسپی رہی اور چند کتابیں اخیر تک زیر تدریس رہیں۔ سالہا سال تک سلم وغیرہ کا درس دیا اسی طرح مختصر المعانی، شرح جامی کا سلسلہ رہا۔ جامعہ میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا تو صحیح بخاری کی جلد اول آپ ہی کے شایان شان سمجھی گئی حضرت نے مظاہر علوم سہارنپور سے اپنے علمی سفر کے ساتھ روحانی سفر کی بھی تکمیل کی جسکی داغ بیل تو جد امجد نے ڈالی تھی پروان چڑھا کر آخری مرحلہ تک پہنچایا۔ حضرت اقدس مولانا شاہ اسعد اللہ قدس سرہٗ سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور نے کی حضرت کو انھیں سے بیعت اور بعد میں اجازت وخلافت کا اس اہتمام سے شرف حاصل ہوا کہ خود مرشد ومسترشد کے علو مقام کا قائل اور کرامت وخوارق کا معترف تھا، حضرت کی نمایاں علمی صلاحیتوں میں تفہیم کی قوت وتصنیفی صلاحیت تھی، متعدد شاہکار تصنیفات، اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، جنمیں سے اکثر نصابیات سے متعلق ہیں اور بعض کتابیں بہت سے مدرسوں میں داخل نصاب ہیں جیسے، تسہیل التجوید، تسہیل المنطق، تسہیل الصرف، تسہیل النحو، علوم آلیہ کی منتہی کتابوں میں سلم کی گرانقدر شرح اسعاد الفہوم، تسہیل السامی فی حل شرح جامی اور حیرت وافسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ فقط ہفتہ عشرہ قبل شرح تہذیب کی شرح مکمل فرمائی ہے...... یوں تو حضرت والا ایک عرصہ سے مریض تھے مگر اللہ نے ایسی ہمت عطا فرمائی تھی کہ معمولات میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔

صبح تہجد کے وقت بیدار ہوکر نماز تہجد اور ذکر ومطالعہ، تلاوت قرآن، بعد نماز فجر سلسلہ تعلیم دن بھر مہمانوں کی آمد ورفت دعا وتعویذ، اپنوں غیروں کے مسائل طلبا یا مدرسین کا کوئی مسئلہ ان پر شفقتیں نیز علاقے کا کوئی قضیہ اسکا تسلی بخش فیصلہ اس کے ساتھ شرح تہذیب، قطبی، جلالین، مختصر، سلم، صحیح بخاری جلد اول وغیرہ کا درس تو بالکل اخیر عمر میں شاطبیہ کو بھی پڑھانا شروع کردیا تھا اور آپنے فرمایا کہ اصل علم تو یہی ہے لیکن بہت زیادہ مشغولیت کی بنا پر نہیں پڑھا سکا اسکے ساتھ علاقے نیز ملک کے گوشے گوشے میں وقتاً فوقتاً نظر آتے تھے اللہ نے وقت میں اتنی برکت دی تھی کہ عام طور پر یہ کتابیں وقت سے پہلے ختم ہوجاتیں تھیں تاریخ میں دیکھا جائے تو خال خال ہی ایسے لوگ نظر آتے ہیں۔

جس دن حضرت کی طبیعت ناساز ہوئی ایک مہمان آئے تھے انھوں نے درخواست کی کہ آرام فرمائیں حضرت کتابیں بعد میں پڑھا دیجئے گا آپ نے فرمایا کہ آرام تو کرنا ہی ہے، موت اپنے وقت پر ہی آئے گی بعد نماز ظہر مسلم کا درس دیا اسکے بعد تقریباً ساڑھے چار بجے جب دورۂ حدیث شریف کے طلباء حاضر ہوئے تو حضرت نے ضروریات سے فراغت کے بعد وضو فرمایا جسمیں دورہ کے ایک طالب علم نے تعاون کیا درمیان وضو میں کچھ سردی سے لگنے لگی تھی فراغت کے بعد زیادہ محسوس ہوئی اور بڑھتی گئی طلباء سے فرمایا جاؤ اور مجھے کچھ اوڑھا دو چند ساعت ہی میں بخار کا غلبہ ہو گیا لوگ دوڑے کچھ دیر میں عصر کا وقت ہو گیا، بستر پر ہی لیٹ کر نماز ادا فرمائی اور کہا کہ جسے ملنا ہو آکر ملاقات کرلے گھر میں اطلاع کر دو....... حضرت کا یہ جملہ تھا کہ تقریباً تمام لوگ دوڑ پڑے اور حال دریافت کرنے لگے لوگوں کی عجیب کیفیت تھی جو زبان و قلم سے نہیں بیان ہو سکتی اسی کشمکش میں مغرب کا وقت ہو گیا لوگوں نے نماز ادا کی حضرت نے کمرہ میں نماز ادا فرمائی مسجد میں جوں ہی امام نے سلام پھیرا حضرت کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر رفیق صاحب کو لیکر آگئے کچھ انجکشن دیئے صلاح و مشورے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ باندہ لے چلیں بہر کیف وہاں کیلئے روانہ ہوئے اسپتال پہنچ کر کچھ دوا وغیرہ دیا کیفیت ٹھیک نہ پاکر لکھنؤ لے چلنے کیلئے تجویز کی ادھر لکھنؤ کے ڈاکٹر غوث صاحب کو اطلاع دی کہ آپ ہم کو راستے میں ملیں ہم حضرت کو لیکر آرہے ہیں کانپور کے قریب ملاقات ہوئی وہاں سے ڈاکٹر صاحب لکھنؤ کیلئے روانہ ہو گئے تقریباً بیس کیلو میٹر پہلے حضرت پر غشی طاری ہو گئی وہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے بہت کوشش کی گئی ڈاکٹروں کو بلایا ادھر ڈاکٹر اپنی کوشش کر رہے تھے ادھر ذات باری کو کچھ اور ہی منظور تھا بس ہوا وہی جو ہونا تھا جمعرات کو چاشت کے وقت دس بجکر دس منٹ پر مورخہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ موجود تمام لوگوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں بہتر سال کی عمر میں ہزاروں تشنگان علم و معرفت کی پیاس بجھاتے ہوئے حضرت اپنے معبود حقیقی سے جاملے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

پس ماندگان میں چار صاحبزادیاں، اہلیہ محترمہ چار سال قبل اسی مہینے میں وفات پاگئیں تھیں بہت ہی نیک تھیں پندرہ بیس پارہ یومیہ تلاوت کرتی تھیں اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تین صاحبزادے حضرت مولانا حبیب احمد صاحب، مولانا نجیب احمد، مولانا حسیب احمد صاحبان تینوں حضرات نے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کبھی بھی مدرسے کچھ نہیں لیا اور فی سبیل اللہ مدرسے کی خدمت کر رہے ہیں جن میں اول الذکر نے بڑی قربانیاں دی ہیں حضرت کے اس دور کو بہت قریب سے دیکھا ہے جب مدرسے کیلئے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر سر پر رکھ کے لاتے۔ برسوں باندہ کا سفر پیدل کیا، ادارے

(باقی صـ ۸ پر)

”وہ جہانِ آذری میں رہے حق کا تازیانہ“

آہ! جناب حضرت مولینا علامہ قاری سید الصدیق احمد صاحب باندوی رح

مولانا ولی اللہ صاحب ولی قاسمی بستوی استاد جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، دھولیہ مہاراشٹر

سوئے ایزداں جہاں سے ہوئے شیخ جب روانہ — ہوئی نوحہ خواں یہ دنیا ہوا نوحہ خواں زمانہ

دلِ شادماں میں ان کے رہی یادِ کبریائی — درِ پاک سے تعلق رہا ان کا عاشقانہ

وہ تھے خادمِ شریعت وہ تھے زائرِ مدینہ — شہِ انبیاء سے ان کو تھا لگاؤ والہانہ

نہ پسند تھا تکبر نہ پسند خودستائی — تھی سخن میں انکساری رہی چال عاجزانہ

جو بڑے تھے جان و دل سے کیا احترام انکا — جو معاصرین تھے ان سے تھا سلوک دوستانہ

وہ تھے پیکرِ محاسن، تھا جمال ان پہ غالب — کہ اصاغرین سے ان کا تھا سلوک مشفقانہ

نہ تھے شہرتوں کے طالب نہ ریا کی بو تھی ان میں — کہ عبادتوں میں ان کا تھا مزاج مخلصانہ

وہ سبھوں کے قدرداں تھے وہ سبھوں کے محترم تھے — وہ جہاں بھی جا کے پہونچے رہی شان خسروانہ

ہمیں داغِ ہجر دے کر وہ چلے ہیں سوئے جنت — ہوئی عمر جبکہ پوری، ہوا ختم آب و دانہ

وہ تھے پاسبانِ ملت، وہی نازشِ جہاں تھے — وہ جہانِ آذری میں رہے حق کا تازیانہ

اسی ذات سے ہراساں تھے صنم کدے جہاں کے — کہ زبانِ حق بیاں کا رہا کفر ہی نشانہ

وہ تھے ذاتِ حق کے عاشق وہ فدائے مصطفےٰ تھے — تھا ضیائے معرفت کا دلِ شادماں ٹھکانہ

وہ تجلیِ مشیت سرِ طور جو تھی چمکی — اسی نور سے منور رہا دل کا آستانہ

بڑے رحم دل تھے انساں بڑی نیک خصلتیں تھیں — کہ چمن کے زیردستوں پہ تھا حکم عادلانہ

درِ خالقِ دو عالم میں ولی کی یہ دعا ہے
ہو لحد پہ رحمتوں کا شب و روز شامیانہ

از حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب
استاذ حدیث دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر

"ایسا کہاں سے لاؤں تجھسا کہیں جسے"

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

"طلبہ سے کہا جاتا ہے کسی شیخ وقت سے منسلک رہو، فراغت سے پہلے بھی اور فراغت کے بعد بھی اپنی اصلاح کے لئے کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق ضرور قائم کرو اس کے لئے کسی نہ کسی خانقاہ میں جایا کرو۔

مگر میری رائے یہ ہیکہ طالب علم کا شیخ تو در حقیقت اس کا اپنا استاذ ہے۔ کیونکہ وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہوتا ہے اس کی علمی و عملی کمزوریاں اسکے سامنے ہوتی ہیں وہ اس کی مزاج سے پوری طرح واقف ہوتا ہے صبح سے شام تک اس کا پورا وقت استاذ کی نگرانی اور زیر تربیت گذرتا ہے لہٰذا وہی اس کی حقیقی اصلاح کی اہلیت رکھتا ہے، اس لئے میرے بھائیو! تم سے میں کہتا ہوں کہ اپنے اساتذہ میں سے جس سے زیادہ مناسبت ہو اسی کو اپنا شیخ بنالیا کرو، وہی تمہارا حقیقی شیخ طریقت اور مخلص مشیر ہے۔ اس پر اعتماد کرو اور اپنا بہی خواہ سمجھو۔

ادھر ادھر بھاگے مت پھرو جو کچھ لینا ہو اسی سے لے لو جب تم اس کو اپنا سب کچھ بنالوگے تو تمہارے لئے جو بات مناسب اور مفید ہوگی قدرت وہی بات تمہارے استاذ کے دل میں القا کردیا کرے گی۔ کاش کہ استاد اور شاگرد اپنے اس مقام اور تعلق کو پہچان لیں تو ہر مدرسہ خانقاہ اور ہر استاد شیخ اور ہر طالب علم مُرید بن سکتا ہے اور پھر علیحدہ سے خانقاہوں کی تلاش کی ضرورت نہ رہے گی۔

یہ وہ کلمات ہیں جو امتِ مسلمہ کی برگزیدہ شخصیت شیخ طریقت، پیکرِ فنائیت، عارف باللہ، یادگارِ اسلاف، برکت الہند حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکیسر تشریف آوری کے موقع پر دارالعلوم فلاح دارین کی مسجد میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے۔

اس ارشاد گرامی کے ایک ایک لفظ سے قائل کی بے نفسی، بے غرضی، اپنے کو مٹائے ہوئے ہونا نیز اساتذہ کا احترام اور طلبہ کی بہی خواہی جھلک رہی ہے۔

افسوس ۲۸ اگست ۹۶ء بروز پنجشنبہ عالم اسلام اور ملت مسلمہ کی یہ مایۂ ناز عظیم ہستی اپنے ہزاروں تلامذہ متوسلین مسترشدین اور محبین کو روتا بلبلاتا چھوڑ کر داغِ مفارقت دے گئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ہم نے چاہا تھا کہ نہ ہو
مگر ہوئی صبحِ فراق

موت کا جب وقت آجاتا ہے ٹلتا نہیں۔

جولائی ۹۶ء کے اوائل میں انکلیشور مرکزی اسلامی کی دار الحدیث کے افتتاح کے موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف کے ایک سبق پڑھانے کی درخواست کی گئی طلبہ کتابیں لے کر بیٹھ چکے تھے۔

مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر سبق پڑھانے سے معذرت فرما دی کہ بھائی میرا اپنا یہ اصول ہے کہ میں کسی دوسری جگہ نہ کتاب شروع کراتا ہوں نہ کتاب ختم کراتا ہوں اور نہ کوئی سبق پڑھاتا ہوں، اس لئے کہ مجھے اس میں وہاں کے کتاب پڑھانے والے استاد کی توہین محسوس ہوتی ہے، اور طلبہ کو اپنے استاد سے بدظنی کا خطرہ نظر آتا ہے۔

اس لئے کہ نو وارد عالم دو چار باتیں زائد بتلائے گا یا اس کی تعبیر و تفہیم نادر ہوگی تو طلبہ خیال کریں گے کہ کاش پوری کتاب ہم انہیں سے پڑھتے ہمارے استاذ کی تفہیم یا علم ایسا نہیں ہے، ظاہر ہے اپنے استاذ کے بارے میں یہ تصور اس سے تحصیل علم اور کسب فیض کے پورے سلسلہ کو بے وقعت کر دیگا، اس لئے میں اپنے طور پر اسکو پسند نہیں کرتا، اور نہ اس پر عمل کرتا ہوں البتہ ختم یا افتتاح کی مبارک مجلس میں حاضر ہو جاتا ہوں مگر سبق اسی استاد سے پڑھواتا ہوں۔

البتہ کچھ باتیں طلبہ کو بطور نصیحت عرض کر کے دعا کرا دیتا ہوں۔

اس ارشاد گرامی کے ایک ایک لفظ سے خود نمائی سے گریز، اپنے علم کے اظہار اور بڑائی سے پرہیز بے نفسی بے غرضی، فنائیت اور اساتذہ کا بے پناہ احترام صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔

دار العلوم زکریا جو گواڑ کے افتتاح کے موقع پر مرحوم کو مدعو کیا گیا تھا، آپ نے اپنے خطاب میں فرمایا بھائیو مقامی علماء سے فائدہ اٹھاؤ، ان سے وابستہ رہو، ان پر اعتماد کرو، وہی آپ کے علاقہ کے حالات اور مسائل سے زیادہ واقف ہیں، دور سے آنیوالے علماء آج آئے کل گئے۔ ان سے اتنے کم وقت میں کتنا استفادہ کر سکو گے وہ تمہاری کیا رہبری کر سکیں گے، الحمد للہ آپکا یہ علاقہ اہل علم اور اصحاب تقویٰ سے مالا مال ہے۔ میں خود ان سے استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتا ہوں۔

جسکے دیدار اور مصافحہ کے لئے ہزاروں لوگ ٹوٹ پڑے ہوں، بڑے بڑے مالدار دعا کرانے کے لئے قطار میں لگے ہوں، متوسلین کی دس دس گاڑیاں سفر میں ساتھ چل رہی ہوں، لوگ ۲، ۲ منٹ کا وقت مانگ رہے ہوں، اتنی تعلقی، پذیرائی، اعزازات اور استقبال

کے موقع پر اتنی فروتنی، عاجزی اور اپنی ہیچمدانی کا برسرِ اجلاس اقرار، اور مقامی علمائے کرام ہی سے استفادہ کرنے اور وابستہ رہنے کی تلقین یقیناً زبردست فنائیت بے غرضی اور بے نفسی کی واضح دلیل ہے۔

جبکہ مرحوم کی افادیت، علم وفضل، درس نظامی کی مشکل ترین کتابوں پر زبردست قدرت برسوں سے ان کی تدریس میں مشغولیت اور ان میں سے بعض کی مبسوط شروحات مرحوم کے قلم کی رہینِ منت ہند وبیرونِ ہند میں بے پناہ مقبولیت لوگوں کی باطنی اصلاح کا طویل سلسلہ یہ سب لوگوں کے علم میں تھا

کسرِ نفسی اور مجاہدہ

مرحوم کا مجاہدہ کسرِ نفسی خدمت خلق اور بندگانِ خدا کی نفع رسانی کی خاطر اپنے آرام اور صحت کا خیال نہ کرنا، دین کی خاطر طویل طویل اسفار ان میں کئی کئی دن کی مسلسل بیداری معمولی سواری سے بھی سفر کرلینا آج کی راحت طلب نسل کے لئے ایک حیرت انگیز مثال تھی اعلیٰ سواریوں اور گراں کرایہ کے سفر سے طبیعت پر گرانی ہوتی کبھی سختی سے منع فرمادیتے، امیرانہ زندگی قطعاً پسند نہ تھی، کھانے پینے رہنے سہنے اور استعمالی اشیاء میں انتہائی سادگی اختیار فرماتے۔ اکثر لنگی کرتے میں بڑے بڑے وسیع اجلاسوں کی صدارت کرنے سے بھی عار نہ فرماتے، اپنی راحت وآرام اور سونے کے اوقات کا اصرار کے باوجود قطعی خیال نہ کرتے۔ ہر آنیوالے کے دکھ درد کو سننا اور اس کے دور کرنے کے فکر میں رہتے۔ کیسے کیسے مہلک امراض سے دوچار تھے لیکن نہ کبھی شکوہ کیا اور نہ علاج پر ضروری توجہ دی، ہروقت امت کے غم میں متفکر رہتے

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم۔

مرحوم کا عند اللہ مقام ومرتبہ

ایک مرتبہ ایک قریہ کے مقامی مدرسہ کے کسی قضیہ کے موقع پر لوگ صلح کرانے کی غرض سے مرحوم کو وہاں لے گئے۔ نقصان پہونچانے والے کو خدا کا خوف دلایا اور اتحاد واتفاق مدرسہ کا تعاون کرنے پر زور دیا۔

مگر مقامی لوگوں کو حضرت کے مقام کا علم نہ تھا انہوں نے مرحوم کو برسرِ ممبر بہت ہی نازیبا کلمات کہے اللہ کے ولی کے ساتھ یہ سلوک قدرت کو پسند نہ آیا کچھ ہی عرصہ بعد وہاں ایسا خطرناک ہندو مسلم فساد ہوا کہ قریہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، مسلمانوں کی کپڑے کی پچاسیوں دکانیں راکھ کا ڈھیر بنادی گئیں کئی کروڑ کا نقصان ہوا آج تک وہاں مقدمات سے لوگ رہا نہیں ہوئے ہیں اس سب کے بعد لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ اس توہین کی سزا ہے۔ تب سب نے حاضر ہوکر معافی مانگی۔

مرحوم کے تعویذ کا اثر

ایک جگہ دو بہنوں کا شادی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پورا کا پورا زیور چوری چلا گیا حضرت مولانا کے پاس اطلاع بھیجی گئی، فرمایا کیا ہرسال زکوٰۃ ادا کی جاتی تھی کہا گیا جی ہاں فوراً تعویذ عنایت فرمایا اور کہا انشاء اللہ مل جائے گا۔

مگر آٹھ سال تک زیور نہ ملا جب بھی حضرت سے ذکر کیا جاتا فرماتے صبر کرو مل جائے گا خدا کی شان آٹھ سال کے بعد ایک دن حیرت انگیز طریقہ پر پورا کا پورا زیور بلا کم و کاست مل گیا۔

یہ حضرت کی دعا کا نتیجہ تھا ورنہ اتنی طویل مدت کے بعد ملنے کی توقع ختم ہو چکی تھی۔

مرحوم کا روحانی و باطنی مقام

مرحوم مستجاب الدعا مقبول بارگاہِ ایزدی، موفق من اللہ، اور اپنے وقت کے قطب تھے، ایسا لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے روحانی کسی منصب پر مقرر کر رکھا ہے اور آپ کی صرف ہمت کو کسی تکوینی امر سے وابستہ کر دیا ہے جیسا کہ یہ مناصب اہل تصوف کے یہاں اولیاء اللہ کے درجات مقامات اور ان سے متعلق خدمات کے لئے تسلیم کئے گئے ہیں اگرچہ خود ولی کو علم نہیں ہوتا کہ میں کس مقام پر فائز ہوں۔

مرحوم کو تعلق مع اللہ عرفان و محبت، کشف و کرامت، ورع و تقویٰ، دل کی بیداری، استقامت و عزیمت کی جو دولت من جانب اللہ عطا ہوئی تھی وہ ماضی قریب اور حال کے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔

رجوعِ عام

مرحوم کے پاکیزہ اخلاق، خدمت خلق مہمان نوازی، انسانی ہمدردی کے۔ مسلم، غیر مسلم، امیر، غریب، شہری، دیہاتی، عالم، جاہل، ملکی، غیر ملکی، سیاسی و غیر سیاسی تمام لوگ معترف تھے۔

بڑے بڑے منسٹر ملاقات و زیارت کے لئے وقت کی تلاش میں رہتے اور دور دراز کا سفر کرتے، مرحوم کے دروازے پر موجود ہجوم میں شامل ہو جاتے۔

ہر گھنٹہ کوئی نہ کوئی گاڑی جھورہ میں واقع قیامگاہ کے دروازہ پر آکر رکتی اور لوگوں کا ایک ہجوم اپنے مسائل کے لئے حضرت کی ملاقات اور توجہ کا محتاج نظر آتا۔

کسی جگہ تشریف لے جاتے تو دورانِ سفر متوسلین اور ضرورت مندوں کی گاڑیوں کا ایک قافلہ ساتھ ہو جاتا اور جہاں پہونچتے وہاں ہجوم کو قابو میں رکھنا منتظمین کے لئے دشوار محسوس ہوتا۔

مدارس و اربابِ مدارس سے تعلق

ہند و بیرونِ ہند میں قائم ہزاروں مکاتب دینیہ مدارس اسلامیہ اور جامعات عربیہ سے مرحوم کا قلبی تعلق تھا۔

مدارس دینیہ کا قیام تو ان کا ایسا مشن تھا کہ اسی کے لئے جیئے اور اسی کے لئے جانِ عزیز قربان کر دی سیکڑوں مدارس کے سرپرست تھے، ہزاروں مدارس ان کی تصدیق کو اپنا سرمایہ افتخار اور اپنے لئے سندِ اعتبار سمجھتے تھے۔

خود جامعہ جھورہ مرحوم نے اپنی ذاتی زمین وقف فرما کر قائم کیا۔ اور ایک جنگلی اور دشوار گذار راستہ پر علم کا ایسا گلشن آباد کیا جو دیکھتے دیکھتے دنیا کے طالبانِ علوم نبوت کے لئے سرچشمۂ حیات بن گیا ملک کے بڑے بڑے جامعات میں ویسے تو سبھی سے قلبی تعلق اور خیر خواہی تھی مگر جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا اور اس کے نوعمر مہتمم عزیزم مولانا غلام محمد

وستانوی کے ساتھ جو خصوصی لگاؤ اور شفقت دیکھنے میں آئی، اور جس پابندی سے ہر سال اس کے سالانہ اجلاس میں تشریف آوری کے لئے وقت نکالا جاتا اسکو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ عزیز القدر مولوی وستانوی موصوف کو حضرت والا نے اپنی خلافت سے بھی سرفراز فرمایا نیز اپنے جامعہ ہتورہ کی شوریٰ کا رکن بھی منتخب کیا۔

فلاحِ دارین اور اسکے خدام کی دلداری فرماتے اور بارہا اپنے قدوم میمنت لزوم سے اسکو سرفراز فرمایا۔ رئیس جامعہ دارالعلوم فلاحِ دارین حضرت مولانا عبداللہ صاحب مدظلہٗ سے بھی بہت محبت فرماتے تھے، جامعہ اسلامیہ ہتورہ کی شوریٰ میں بھی حضرت کو شامل فرمایا، اور بارہا ان کے قریہ کاپودرہ تشریف لائے۔

خورد نوازی اور شفقت

ملک کے بڑے چھوٹے بھی اہلِ علم واصحاب درس آپ سے والہانہ محبت رکھتے تھے آپ کی شفقتیں سب کو اس طرح حاصل تھیں کہ یہ معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ کس سے زیادہ تعلق ہے۔

راقم السطور سے بلا استحقاق ایسی محبت اور شفقت سے پیش آتے کہ حیرت ہونے لگتی، اس خاکسار کو مرحوم کے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے کا موقع نصیب ہوا اور عجیب بات ہے، ان مقامات کے کسی جلسہ میں ایسا نہ ہوا کہ حضرت نے حکم دے کر بیان نہ کرایا ہو۔ باوجود شرمندگی اور ندامت کے الامر فوق الادب کے تحت بیان کرنا پڑتا تھا اللہ تعالیٰ ان کی اسی توجہ اور محبت کو میرے لئے ذخیرہ آخرت بنائے آمین۔

حضرت نے متعدد مرتبہ اس خاکسار کو حاضری کے لئے حکم فرمایا مگر افسوس ان کی حیات میں میں یہ سعادت حاصل نہ کر سکا، اس کا ساری زندگی مجھے قلق رہے گا۔

وصال

موت جتنی یقینی ہے، اس کا وقت اتنا ہی غیر یقینی ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں امراض کی وجہ سے یہ خطرہ تو ہر وقت لگا رہتا تھا کہ یہ چراغ کہیں گل نہ ہو جائے مگر مرحوم اتنی جلدی پردہ فرما جائینگے اور زمین اوڑھ کر ہمیشہ کے لئے ہم سے رخِ زیبا چھپا لیں گے۔ اور ہم ع

"روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد" کہتے رہ جائیں گے، اسکی توقع نہ تھی۔

مرحوم اچھے خاصے روزانہ بخاری شریف کا درس دے رہے تھے کہ ۲۷ اگست کی شام کو اچانک عصر کے وضو کے دوران فالج کا حملہ ہوا اور دماغ کی ایک رگ پھٹ گئی مقامی طبی امداد کے بعد فوراً لکھنؤ لے جایا گیا راستہ میں بیہوشی طاری تھی لکھنؤ کے قریب خون کی ایک قے ہوئی، اس کے جھٹکے سے ہوش میں آئے اور فرمایا کہ باندہ اور ہتورے کے احباب کو میرا سلام کہنا اور قصور کی معافی چاہنا اور مدرسہ کے باب میں اپنے اپنے کام میں لگے رہنے کی وصیت فرمائی، اور پھر ایسی خاموشی اختیار کی کہ اس فانی دنیا کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا اور اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس شاداں وفرحاں روانہ ہو گئے۔ ~

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

(باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

مولانا عبد الواحد قاسمی
جامعہ اسلامیہ قاسم العلوم چندگڑھ کولہاپور مہاراشٹر

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے ......

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۶ء

بروز جمعرات گیارہ بجے دن بذریعہ ٹیلی فون جامعہ اسلامیہ قاسم العلوم چندگڑھ ضلع کولہاپور، مہاراشٹر میں یہ جانکاہ خبر ملی کہ عالم اسلام کی ایک اور مایۂ ناز عظیم ہستی قاری صدیق احمد صاحب باندوی کی روحانی شفقتوں سے ہم سب محروم ہوگئے، اس عظیم سانحہ کی اطلاع ملی، دل کو یقین نہیں آیا اور بذریعہ ٹیلی فون ہتھورا (باندہ) سے رابطہ کرنا چاہا ہزار کوشش کرنے کے باوجود رابطہ قائم نہ ہوسکا تو مجبوراً گجرات فون لگایا جہاں سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ملتِ اسلامیہ کا وہ عظیم مصلح و داعی جو تقریباً نصف صدی سے ہزاروں نفوس کا تزکیہ کر رہا تھا، جس نے لاتعداد قلوب کی چارہ گری فرمائی اور اپنی روحانی اور دل افروز باتوں سے بے شمار دلوں میں ایمانی حرارت پیدا کی، جس نے مدتوں علم و حکمت، رشد و ہدایت، عمل و تزکیہ کے چراغ روشن کر رکھے تھے آج صبح تقریباً ساڑھے دس بجے علم و فضل کی یہ دنیا، فکر و عمل کی کائنات، تقویٰ و طہارت کا پیکر، رشد و ہدایت کا نشان، اخلاص و للٰہیت کی علامت، حُبِّ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کی یادگار، پوری ملت کو سوگوار چھوڑ کر ربِ حقیقی سے جاملے،

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اس حادثہ جانکاہ پر آنکھیں اشکبار ہوگئیں، دل بیقرار ہوگیا، اور روح مضطرب و بے چین ہوگئی کہ نہ جانے ہم کس دور میں آگئے ہیں کہ یکے بعد دیگرے صالحینؒ اکابرین کا مبارک سایہ ہم سے اٹھتا جا رہا ہے، ابھی تو حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ مفتی اعظم ہند، حضرت مولانا قاضی اطہر صاحبؒ مبارکپوریؒ اور حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ کے بچھڑ جانے سے زخم تازہ ہی تھا، آنکھیں اشکبار ہی تھیں کہ اس عظیم سانحہ نے اور بھی مضطرب اور بے چین کر دیا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب اس دور کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے جو ہمارے اسلاف، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، امیر التبلیغ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے روحانی فرزندوں کی علمی و عملی جد و جہد سے روشن و منور تھا ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

لیل و نہار کے ہنگاموں میں یوں تو نہ جانے کتنے لوگوں کے بارے میں خبریں ملتی ہیں کہ وہ ہم سے رخصت ہوگئے، کتنوں کے چھوٹ جانے سے شدید رنج و الم ہوتا

ہے، لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جنکی وفات کی خبر بجلی گرادے، اور انسانیت کانپ اٹھے اور پورا عالم روشنی سے محروم ہو جائے۔

جامعہ میں اس حادثہ کے خبر موصول ہوتے ہی اسباق موقوف کر دیئے گئے، اساتذہ اور طلبا تلاوتِ کلام اللہ اور کلمہ طیبہ کے ورد میں مشغول ہو گئے، ورد اور قرآن خوانی کا یہ سلسلہ عصر تک چلتا رہا، بعد نماز عصر مہتمم جامعہ مولانا ضیاء الحق صاحب نے تعزیتی و دعائیہ نشست سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت کے تحت ہم سے جدا تو ہو گئے مگر دلوں کی دنیا، یادوں کی بستی سے آپکا نقشِ جمیل مٹ جانا ممکن نہیں، آپ کے پیکر میں معصومیت، اخلاق، اور علم و عمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ان کے نقوش دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتے، آپکی عبقریتِ روحانی، مجاہدات شاقہ اور علمی و عملی کمالات بے مثال و منفرد تھی، زبان ایسی عام فہم کہ سب سمجھیں، بیان ایسا پُر اثر کہ دل مانے، میں نے مجلس میں اٹھنے بیٹھنے والوں سے اکثر کہتے ہوئے سنا اصحابی کالنجوم کی مثال دیکھنی ہو تو قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کو دیکھو، آپ کی سادگی و کسر نفسی بے مثال تھی۔ بڑے بڑے مادیت پسند شہروں میں بارہا آپ کا آنا جانا ہوا لیکن آپ کی قناعت پسندی، سادگی اور خودداری میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ تواضع و خاکساری کا یہ عالم کہ بے تکلف ہونے کیلئے بس ایک ملاقات کافی تھی، بہرحال حضرتؒ کا سانحہ کسی ایک خاندان اور کسی ایک ادارہ کا سانحہ نہیں بلکہ عالم اسلام کا عظیم ترین سانحہ ہے اور ملت اسلامیہ کا ہر فرد اس سے متاثر اور رنجیدہ ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں سوجھ بوجھ کے حامل، اسباب و علل سے آگاہ، نشیب و فراز سے واقف، عواقب و نتائج سے باخبر قرآن و حدیث کا گہرا علم رکھنے اور معانی مفاہیم کو سمجھنے والے قاری صدیق احمد باندویؒ کی نظیر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

خدا اس عظیم سانحہ کے خلا کو پُر فرمادے اور عالم اسلام کو اسکا نعم البدل عطا کرے، پسماندگان کو صبر جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے!!! آمین ●

(صـ۶۶ کا بقیہ)

مصروف عمل ہیں۔ ہزاروں لوگ آپ کے تعویذوں اور دعاؤں سے بھی فیضیاب ہوتے ہیں۔"

آخر میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر شہنشاہ قلم مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ نے جو مفصل مضمون تحریر کیا تھا اس کے دو جملوں اور ایک مصرع کو میں حضرت باندوی رحمۃ اللہ علیہ پر بھی بالکل منطبق پا رہا ہوں۔ یعنی :-

"حیرت اس پر نہیں کہ یہ دولت ہم سے چھین لی گئی حیرت اس پر ہے کہ یہ دولت اتنے دنوں تک ہم میں رہی کیسے؟

ع تو بہارِ عالمِ دیگر زکجا بہ ایں چمن آمدی ..

مدّتوں رویا کرینگے جام و پیمانہ مجھے

از: مولانا ابو سفیان صاحب قاسمی ناظم جامعہ شرقیہ اسلامیہ لونیہ ڈیہہ اعظم گڈھ

جمعرات ۲۸ اگست ۹۶ء کو دن میں ٹھیک ۱۰ بجکر ۲۰ منٹ پر پوری ملت اسلامیہ پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔

وہ ہستی جو ۷۷ سال سے امت کے غم میں مضطرب تھی اطاعت خداوندی سے جس کا قلب اطہر منور تھا جس کے علم و معرفت کے فیضان سے ہزاروں تشنگان علوم نبوت سیراب ہو رہے تھے جو بیک وقت معلم، مربی، مجاہد، داعی، صوفی اور مصلح الامت جیسی تمام صفات کا حامل تھا جس کو دیکھ کر صحابۂ کرام کی زندگی کا نقشہ نظروں میں گھوم جاتا تھا جس کی سادگی بے مثال تھی، خوف خدا اور اتباع سنت جس کی زندگی کے ایک ایک لمحے میں شامل تھی، جو ان صلوٰتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العٰلمین کا مکمل نمونہ تھا۔

وہ ہزاروں جاں نثاروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی سے جاملا۔ حضرت قاری صاحبؒ کی ذات جن کا محض وجود ہی عالم اسلام کے لئے باعث رحمت و برکت تھا۔ آپ کو علم و فضل میں کمال حاصل تھا، اعمال صالحہ، زہد و تقویٰ، اور اخلاص میں بھی آپ بے مثال تھے۔ دنیا سے بے رغبتی ایسی تھی کہ آپ کن فی الدنیا کانک غریب او عابری سبیل کی زندہ تصویر تھے، آپ بے انتہا مہمان نواز تھے، آپ حسن اخلاق اور الفت و مروت کا پیکر تھے، عجز و انکساری اور تواضع آپ کے اندر بھری ہوئی تھی، زہد و تقویٰ اور مجاہدے میں آپ اسلاف کی یادگار تھے۔ علوم نبوت سے حد درجہ شغف تھا یہ کہنا بجا ہوگا کہ آپ کو اس سے انتہائی درجہ کا عشق تھا آپ نے حصول علم کے سلسلہ میں حد درجہ جد و جہد فرمائی مختلف جگہوں کا سفر کیا، اساطین امت جہاں جہاں دستیاب ہوئے اکتساب فیض کے لئے ان کے دروں پہ جبیں سائی کی، یہاں تک کہ آپ نے اپنے وطن مالوف سے رخت سفر باندھا، اور کانپور، پانی پت، ٹونک، دہلی، مدرسہ شاہی مرادآباد اور مظاہر علوم سہارنپور کے علاوہ مظفرپور تک علم کے لئے صحرا نوردی کی۔

آپ اساتذہ کی نظر میں اتنا مقبول رہے کہ حضرت شاہ اسعد اللہ صاحب ناظم سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت الاستاد مفتی محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے خدا قیامت میں جب پوچھے گا کیا لائے ہو تو میں صدیق احمد کو پیش کردوں گا آپ نے اپنی ساری زندگی دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے وقف کردی ملک کے مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد آپ نے ۱۳۷۱ھ میں جامعہ عربیہ ہتورہ کی بنیاد ڈالی۔

مدرسہ کا ابتدائی دور بڑی کس مپرسی کے عالم میں گذرا، تعلیم و تعلم کی ابتدار چھپر میں ہوئی یہی جامعہ کی کل کائنات تھی، موسم کے سرد و گرم کو برداشت کرتے ہوئے اساتذہ اور طلبار دلجمعی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ایک بار بارش اور کیچڑ میں لت پت تعلیم و تعلم کا سلسلہ دیکھ کر حضرت کا دل بھر آیا اس کے بعد اپنے استاد حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ کو صورتِ حال لکھی، حضرت نے تعمیر کے سلسلے میں کچھ رقم روانہ فرمائی اور ہمت افزائی فرماتے ہوئے یہ حکم بھی کیا کہ اب کام بندمت کرنا اس کے بعد خداوند قدوس کی طرف سے ایسی دستگیری ہوئی کہ تا حال ضروری اسباب و وسائل مہیا ہوتے چلے آرہے ہیں اور یہ ادارہ انتہائی کوردہ پسماندہ اور جہالت زدہ علاقے میں علوم نبوت کی ضیا پاشیوں میں مصروف ہے

حضرت کے پڑھانے پڑھنے کا معاملہ بالکل انوکھا تھا، ایک بار احقر کی باندہ حاضری میں حاضری ہوئی حضرت عصر کی نماز کے بعد دور دراز سفر سے تشریف لائے اور فوراً سبق پڑھانے کا اعلان کر دیا تمام طلبہ حضرت کی نشست گاہ سے متصل برآمدے میں حاضر ہو گئے اور ترتیب وار جماعتیں حضرتؒ کی خدمت میں پہونچتی رہیں اور حضرت سبق پڑھاتے رہے یہ سلسلہ نماز کے وقفے کے علاوہ عشار تک قائم رہا، اسی دوران تعویذ حاصل کرنیوالی ایک کثیر مخلوق بھی مستفیض ہوتی رہی، عشار کی نماز کے فوراً بعد حضرتؒ تصنیفی سلسلہ میں مصروف ہو گئے اس وقت شرح جامی کی شرح زیر ترتیب تھی اور ما نافیہ کی بحث زیر قلم تھی اسی اثنار میں واردین و صادرین کے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی قائم رہا، رات کو ساڑھے نو بجے بعض مہمانوں کو شہر باندہ روانہ کیا حضرتؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا حبیب احمد صاحب نے جیپ کے ڈرائیوری کی خدمت انجام دی، جب میں نے پوچھا حضرتؒ کوئی ڈرائیور نہیں ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ اباجان نے کہا کہ مہمانوں کی یہ خدمت تم کرتے رہو، شاید اللہ تمہاری اسی سے مغفرت کر دے، مہمانوں کی روانگی کے وقت سفر کے بارے میں حضرت بار بار یہ تاکید فرماتے رہے کہ باندہ پہونچنے کے بعد مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہونچنے پائے، ان کو پانی پلا دینا، اور جن لوگوں کی سواریاں آگے کی نہ ہوں ان کی رات گذرنے کا پورا انتظام کرکے پھر واپس آنا یہ تھے حضرت کی بے مثال تواضع جو آپ مہمانوں کے ساتھ پیش کرتے تھے، آپکے اپنے تمام اکابرین و معاصرین سے یکساں روابط و تعلقات تھے۔ آپکی ذات مقبولِ خلائق تھی اللہ تعالیٰ حضرتؒ کا بدل رحمت فرمائے اور آپکے درجات کو بلند فرمائے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

رباعیات

مولانا محمد زبیر صاحب اشاعتی
یولہ، ضلع ناسک

نالۂ غم در فراق باندویؒ

(۱)

منھ موڑ کے ایک مردِ حق آگاہ گیا — موجود ابھی تھا، ابھی ناگاہ گیا
صدیقؒ کی رحلت پہ کہا ہاتف نے — اقلیم تصوف کا شہنشاہ گیا

(۲)

افسوس کہ وہ جوہرِ قابل نہ رہا — اے میرے خدا رونق محفل نہ رہا
اصلاح کا طالب ہے بڑی مشکل میں — صدیقؒ سا اب مصلحِ کامل نہ رہا

(۳)

باطل سے جو تھا برسرِ پیکار گیا — اسلام کا اک گوہرِ شہوار گیا
رہرو کو ہے اندیشہ بھٹک جائیگا — صد حیف کہ اب کارواں سالار گیا

(۴)

ملت کے نگہبان کی باتیں کرلو — اک صاحب عرفان کی باتیں کرلو
اجڑی ہوئی محفل کے فسردہ لوگو — صدیقؒ کے فیضان کی باتیں کرلو

(۵)

کس طرح وہ کہلائے مقدر کا دھنی — پل پل اُسے چبھتی ہے مصیبت کی انی
اب جائے کہاں دھوپ میں چلنے والا — باندہ میں ہی ملتی تھی جسے چھاؤں گھنی

(۶)

عرفاں کے پنپنے کا سہارا ٹوٹا — انوار کا تابندہ ستارہ ٹوٹا
اک فرد کے دنیا سے چلے جانے پر — احسان و تصوف کا منارہ ٹوٹا

(۷)

ادبار کی حرماں کی مصیبت کی گھٹا — دکھ درد کی تکلیف و اذیت کی گھٹا
اک عارفِ صادق کی جدائی سے زبیر — ہر سمت برستی ہے عقوبت کی گھٹا

محمد اسلم صدیقی
بونارا، بوبنور

میرے حضرتؒ کی شفقتیں

میں ایک دنیادار معمولی آدمی ہوں، گورینی مدرسہ سے متصل پتھر بالو اور مختلف تعمیراتی سامان کا تاجر ہوں، دس سال پہلے کچھ لوگوں سے سنا کہ باندہ میں ایک بزرگ ہیں، زیارت کی تمنا ہوئی اس ارمانوں کو دل میں سجائے تھا کہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے استاذ مولانا اکرام اللہ صاحب سے حضرت والا کے بارے میں تفصیلی علم ہوا جس سے ملاقات کا شوق اور بڑھ گیا، انہی دنوں معلوم ہوا کہ بھدوہی تشریف لانے والے ہیں مولانا موصوف کیساتھ بھدوہی حاضر ہوا لیکن کسی وجہ سے حضرت کا پروگرام ملتوی ہوگیا۔

ایک روز دوکان پر بیٹھا تھا کہ ایک طالب علم نے آکر خبر دی کہ مولانا اکرام اللہ صاحب بلارہے ہیں باندہ سے حضرت قاری صدیق احمد صاحبؒ تشریف لائے ہیں دوڑتا ہوا خدمت میں حاضر ہوا، سلام ومصافحہ کیا اور حضرت کے سراپا نور کا دیدار ہوا پھر ریاض الجنۃ کے ایڈیٹر مولانا عبدالعظیم ندوی نے حضرت سے تعارف کرایا کہ ہمارے مدرسہ کے پڑوسی ہیں ان کے لئے دعا فرمادیں۔ حضرت نے شفقت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا تھوڑی دیر بعد پیدل چلکر دوکان پر تشریف لاکر دعا فرمائی۔

یہ پہلی ملاقات تھی لیکن میری زندگی کی کایا پلٹ گئی دھیرے دھیرے تبدیلی آتی گئی یہ حضرت کی خصوصی محبت ونظر کا کمال تھا، سچ کہا گیا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کچھ دنوں بعد مولانا نوازش علی صاحب فیض آبادی مدظلہ سے ملاقات پر باندہ کا سفر طے ہوا اور انہی کی ہمراہی وکرم سے حضرت تک وہاں رسائی ہوئی۔ یہ اس گنہگار کی پہلی حاضری تھی۔ پہونچے تو عصر کی نماز کیلئے حضرت والا مہمانخانہ سے نکل رہے تھے سلام ومصافحہ کے بعد حضرت نے گلے سے لگالیا اور دیر تک لگائے رکھا۔ راستہ میں سوچ رہا تھا کہ وہاں میرا شمار وقطار تو ہوگا نہیں بس چپ چاپ زیارت کرکے واپس ہوجاؤں گا لیکن حضرت کی بے پناہ شفقت ومحبت دیکھکر دل پر ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ حضرت نے مجھ جیسے گنہگار کو سینے سے لگاکر مجھ پر اور میری آنیوالی نسل پر بہت بڑا احسان کیا حضرت کی برکت سے نماز ودیگر وظیفے کی توفیق ملی۔ اللہ ورسول کی باتوں کی قدر واہمیت پیدا ہوئی۔

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا جسکی بناء پر حضرت سے

تعلق وقرب بڑھ گیا۔ ایک بار مشرقی اضلاع کے دورے پر تھے کہ یہاں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے۔ میری درخواست پر غریب خانہ پر تشریف لیگئے اور سال دو سال کے اندر تین بار تشریف لائے جو یقیناً حضرت کی خصوصی محبت کی علامت ہے۔ جنوری ۱۹۹۵ء میں گورینی مدرسہ پر عالمی اجتماع کے موقع پر اکابرین اور علماء کے قیام وطعام کا خصوصی اور بہتر سے بہتر انتظام تھا حضرت بھی دن میں دس بجے تشریف لائے اور فرمایا کہ میرا قیام اسی دوکان پر رہے گا جبکہ سردی بھی غضب کی تھی اور عشا کی نماز بعد فرمایا کہ چلئے آپ کے گھر پر رات گذاریں گے اللہ اکبر میرے لئے خوشی کی بات تھی تشریف لائے میرے تین رشتہ دار فجر کی نماز میں نہیں پہونچے سوتے رہے فجر بعد حضرت نے دروازے پر بغیر انھیں مخاطب کیے ہوئے نماز کی اہمیت پر اس انداز سے چند باتیں فرمائی کہ وہ لوگ بہت متاثر ہوئے اور الحمد للہ نماز کے بالکل پابند ہو گئے یقیناً یہ حضرت کی نگاہ کرم و توجہ کا اثر ہے ایکبار حضرت کے ادارہ جامعہ عربیہ کے سالانہ امتحان کے موقع پر مدرسہ گورینی کے استاذ قاری محمد اسماعیل صاحب اور مئو کے قاری ظفر احمد صاحب کے ہمراہ باندہ حاضری ہوئی واپسی پر بندہ کی گاڑی کے لئے تیل کا پیسہ حضرت دینے لگے عرض کیا حضرت مجھے بس دعا چاہئے فرمایا تمکو لینا پڑے گا اللہ گواہ ہے مجھے تم سے محض اللہ واسطے محبت ہے تمہاری بھلائی کیلئے دعا کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا یہ سب باتیں اب یاد آتی ہیں تو دل روتا ہے۔

حضرت سے جتنا تعلق بڑھا حضرت کا رعب بھی بڑھتا گیا اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ اپنے دل کی بات کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اکثر اپنے دوست جامعہ کے استاذ قاری منظر علی فاروقی کو واسطہ بناتا تھا حضرت خوش ہوکر دعا دیتے اور کسی درخواست کو رد بھی نہ فرماتے تھے۔

حضرت کے انتقال کے بعد مجھے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ حضرت اب اس دنیا میں نہیں رہے جب میرے سامنے وفات سے متعلق تذکرہ ہوتا تو مجھے بہت الجھن ہوتی اور جی چاہتا کہ کہیں چھپ جاؤں لیکن اب دھیرے دھیرے دل ودماغ نے قبول کرلیا کہ آہ اب حضرت نہیں رہے۔ دین وشریعت اور احکامات الٰہیہ سے متعلق انکی ہدایات باقی ہیں انشاء اللہ اسی میں ہم سب کی عافیت ہے اور دل سے تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کی تمام یادگاریں بالخصوص ان کے ادارہ کو تاقیامت باقی رکھے اور حشر کے میدان میں اپنے بزرگوں سے عقیدت ومحبت کے صدقے ہم سب کا بیڑا پار ہو۔

احب الصالحین ولست منهم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

قاری صاحب کی وفات

از مولوی فخر الاسلام مظاہری دہلی
مورخہ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی کی وفات کی خبر ملی طبیعت اس وقت سے انتہائی ملول اور پژمردہ ہے۔ ادھر عرصہ سے دل میں ایک کسک ہتورہ جانے کی بار بار اٹھتی تھی لیکن ؎

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

حضرت مولانا سب کے لئے سب کچھ تھے۔ ہمارے لئے استاد بھی تھے، ترجمہ پارۂ عم، ہدایۃ النحو، شرح جامی شرح تہذیب، قطبی وغیرہ میں نے حضرت مولینا سے پڑھیں اور کسی ایک استاذ سے جو زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھ سکتا تھا وہ حضرت مولانا ہی سے پڑھیں۔ حل مطالب پر اکتفا کرنے والا اور درسی تقریر کم سے کم کرنے والا میں نے حضرت مولانا سے زیادہ کسی کو نہ پایا۔ بعض مرتبہ خیال بھی ہوا کہ حضرت مولانا کی بزرگی کی وجہ سے کم الفاظ میں بات پوری ہو جائے اور سبق میں اشکال گو پیش نہ آئے لیکن مواقع تقریر میں تو تقریر ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ بات اس وقت بھی محسوس ہوتی تھی بعد میں تو یعنی ہتورہ سے آنے کے بعد خوب محسوس ہوئی کہ حضرت مولانا کے موجز تما الفاظ میں جو تفہیم ہو جاتی تھی وہ لمبی تقریروں میں کہیں نظر نہ آئی۔

ایک مرتبہ ہمت کر کے اپنی سوء استعداد کا شکوہ بھی کر دیا تھا کہ حضرت باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، جو آتی بھی ہیں تو محفوظ نہیں رہ پاتیں، استعداد اچھی نہیں ہو پاتی، فرمایا، "تمہاری استعداد کی ضمانت میں لیتا ہوں"۔ استعداد اچھی ہو پاتی یا نہیں وہ تو خیر!! لیکن سکون و اطمینان خوب ہو گیا۔ بد استعدادی کی تشویش ختم ہو گئی۔

بعض اور واقعات پیش آئے۔ ہتورہ میں بعض کمرے ایسے تھے جو تنہا ایک طالب علم کے لئے نامزد کئے جاتے تھے۔ ان میں ایک ہی کے رہنے کی گنجائش ہوتی تھی، شوق ہوا کہ مجھے وہ کمرہ مل جائے، میں نے بجائے باضابطہ درخواست کے حضرت ہی سے آرزو کا اظہار کر دیا۔ یہ بات شروع شعبان میں ہوئی، اس کے بعد امتحان ہوا، شعبان رمضان کی چھٹی ہو گئی۔ میں الٰہ آباد آ گیا، الٰہ آباد سے والدین کا پروگرام رڑکی جانے کا تھا، میں بھی ساتھ گیا۔ رمضان اور عید وہیں گذری، عید کے بعد والدین کے ہمراہ لکھیم پور جانا ہوا۔ وہاں سے جب الٰہ آباد واپسی ہوئی تو شوال کے مہینہ کے

بیشتر ایام گذر چکے تھے، جب میں ہتورا پہونچا تو تعلیمی سال کا
ماہ اول بھی شوال ختم کے قریب تھا۔ مدرسہ میں حضرت مولینا
سے ملاقات کی، سلام و مصافحہ کے بعد حضرت نے جو پہلی
بات فرمائی وہ یہ تھی۔

"اب تک کہاں تھے" تمہارے لئے ہم کمرہ روکے ہوئے
ہیں" میں نے اپنی تاخیر کے اسباب بتلائے اور بتلایا کہ کھیم پور
بھی جانا ہوا تھا پوچھا کس کے پاس؛ مولانا عبد السلام صاحب سے
میں نے اپنا ربط بتلایا۔ دیر تک مولانا عبد السلام صاحب
سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت مولانا جس کے لئے
بھی کمرہ چاہتے اسے مل ہی جاتا۔ حضرت کی گوناگوں مصروفیتوں
علمی، طبعی، دماغی ہر طرح کی ۲۴ گھنٹوں کی مشغولیتوں کو
دیکھتے ہوئے اور جس قدر کام حضرت نے اپنے ذمہ کر رکھے
ہیں کہ سب اپنی اپنی جگہ پر اہم ان کے پیش نظر اس طرح کی
چھوٹی سی بات کی طرف توجہ اور التفات حضرت کے لئے کیسے ممکن
ہے؟ اور وہ بھی مجھ جیسے ہیچ مدان کے ساتھ ایسی شفقت
میرے وہم میں بھی نہ تھی، یہ بات میرے لئے باعث حیرت
بنی ہوئی تھی۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ حضرت ادنیٰ تعلق اور
نسبت کا بھی بڑا لحاظ فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا کی معیت و رفاقت میں سفر کی بھی سعادت
حاصل ہوئی، سنگم ایکسپریس کا ریزرویشن کانپور سے تھا، کانپور
میں ٹرین پر سوار ہوئے، میرٹھ ہو کر روڑکی جانا تھا۔
ٹرین چلی، کچھ دیر کے بعد جب حضرت نے سونے کا ارادہ فرمایا تو
یہ کہہ کر لیٹے کہ تہجد کے وقت اٹھا دینا، یکم جنوری کی ٹھنڈ

تھی میں بے خبر سویا۔ حضرت مولانا نے جب اٹھایا اس وقت بھی
فجر کا وقت شروع ہونے میں بہت دیر تھی، معمولات سے
فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ کتاب لائے ہو؟ میں نے عرض
کیا وہ تو نہیں لایا۔ فرمایا اگر لائے ہوتے تو میں پڑھا دیتا
تمہارا سبق کا حرج نہ ہوتا، حالانکہ اس سال میری کتاب ہدایۃ النحو
نور الایضاح، وغیرہ تھیں۔ اور ضابطہ میں کوئی سبق حضرت
مولانا سے متعلق نہ تھا۔

روڑکی کا سفر یوں پیش آیا تھا کہ حضرت کو روڑکی
والوں نے مفتی زین الاسلام صاحب کے ذریعہ خط لکھوا کر بلوایا
تھا اور ہتورا میں سب کو معلوم تھا کہ کسی نئے سفر کا پروگرام اس
وقت بن پانا نہایت دشوار ہے، لیکن حضرت مولانا نے نہ معلوم
کس کس طرح وقت نکال ہی لیا، سفر کر کے روڑکی تشریف لے
گئے۔ روڑکی والوں نے جب آمد و رفت کا کرایہ پیش کیا تو
حضرت مولانا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے تو حضرت شیخ الحدیث
سے ملنے کے لئے سہارنپور آنا ہی تھا، چنانچہ نہیں لیا کسی طرح
نہیں لیا۔

حضرت کی ولایت، بزرگی، اور کرامت کا ذکر و تذکرہ
تو وہ لوگ کریں گے جو ان اوصاف کی حقیقت سمجھے ہوں۔
اور خود بھی کچھ حصہ ان اوصاف سے پائے ہوئے ہوں۔

لا یعرف قدر الغزالی من کان بعد الغزالی
الا ان یکون مثل الغزالی او فوق الغزالی

البتہ دو باتیں جنہیں حضرت کی کرامت سمجھیں یا برکت
اور خصوصیت اس ہیچمدان کو بھی کھلے طور پر محسوس ہوئی
اور ہر اس شخص نے محسوس کی ہونگی جو بحیثیت طالب علم ہتورا میں
رہا ہو۔

ایک یہ کہ حضرت مولانا کے ہاں کتاب کے ختم ہونے کا کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا جبکہ حضرت کے اسفار کے تسلسل کے ساتھ یہ یقین آنا ہی مشکل ہے کہ حضرت سے درسیات بھی متعلق رہی ہونگی۔ اور کتابیں بھی ایک دو نہیں بلکہ ہر سال چھ سات ان میں بھی زیادہ تر منتہی فنون کی۔ مثلاً شرح جامی، شرح تہذیب، قطبی، مختصر المعانی، جلالین اور کبھی سلّم العلوم بھی۔ ہجوم مشاغل جیسے کچھ حضرت مولانا کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور جس نوعیت کے تھے کہ ان میں سے ہر مشغلہ بالکل مستقل تھا اور پورے طور پر جمعیت خاطر چاہتا تھا اور بعض تو دوسرے سے بالکل متضاد تھے ان کو جو شخص بھی جانتا ہے اور درس نظامی کی تدریس کے تقاضا کو سمجھتا ہے اس کے لئے حیرت واستعجاب کی انتہا نہیں رہتی، کہ حضرت مولانا اتنی کتابیں علم وفن کی کیسے پڑھاتے اور ختم کراتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایسی خصوصیت یا کرامت ہے جو حضرت ہی کا حصہ تھی۔

دوسری بات حضرت مولانا کے تلمذ کی برکت اور ادارے کی خاص خاصیت تھی جبکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت کے ہاں قانون اور ضابطہ نام کی چیز بس برائے نام ہی تھی۔ ایک طرح سے کہنا چاہیئے کہ طلبہ کو خاصی آزادی حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بے عمل اور آزاد طلبہ کی یہاں خاصی کھپت ہے لیکن ہتھورہ کے بعد مظاہر علوم اور دارالعلوم جانا ہوا، وہاں بھی اور پھر علیگڈھ اور دہلی میں بھی دوسرے مدارس کے فضلاء کے ساتھ ہتورہ کے فیض یافتہ بھی ملے۔ ان سب میں علم وعمل دونوں اعتبار سے ہتورہ کے طلبہ بیّن طور پر نمایاں نظر آئے۔ علم وعمل کا ایسا اچھا نتیجہ کہیں اور کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایسا عمدہ رزلٹ کسی دوسرے ادارے کا میری نظر سے نہیں گذرا۔

علم وعمل میں رسوخ کیسے پیدا ہو، حضرت مولانا اس کے طریقے تبلاتے تھے۔ طلبہ میں وعظ فرماتے تھے کتاب "تلبیس ابلیس" پڑھ کر سناتے تھے۔ اور یہ چیزیں حضرت کے وظائف طبعیہ میں داخل تھیں۔

تذکیر وموعظت کے نادر طریقے اختیار فرماتے تھے ایک مرتبہ ایک استاذ (مولانا سراج احمد) کو تعین فرمایا کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں "ان اللہ لا یحب" یا "واللہ لا یحب"، یا "لا یحب اللہ" الخ وغیرہ آیا ہو اس آیت کا ترجمہ بعد نماز عصر سنا دیا کریں، غرض نصح وخیر خواہی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ طلبہ میں جیسے جیسے علم بڑھتا جائے اسکے ساتھ ساتھ عمل بھی بڑھتا جائے کہ یہی مقصود ہے۔ لعلمت القرآن والعلم والعمل جمیعا۔ حضرت عثمان رضؓ کا ارشاد ہے آثار میں موجود ہے۔ اور انا اعلمکم باللہ واخشاکم اللہ حدیث شریف ہے۔ اور اس کا اس قدر خیال واہتمام تھا کراوابین وتہجد تک کی پابندی طلبہ سے چاہتے تھے زمانے تھے، علوم دین حاصل کرنے والے طلبہ کی خاصی تعداد آہ سحرگاہی کی عادی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ میں نے ایک کتاب سبق سے الگ خارج میں پڑھنے کی حضرت سے درخواست کی حضرت نے وقت نہ ہونے کا عذر کیا پھر فرمایا، اچھا جب میرے پاس وقت ہوا کریگا میں تمہیں

بحال کر لوں گا۔ میں نحو کی کتاب زیادہ تر دو وقتوں میں پڑھی
ایک عصر کی نماز کیلئے جاتے وقت حضرت کے حجرہ سے مسجد کے
درمیانی فاصلہ میں۔ دوسرے طلوعِ فجر سے پہلے شب کے اخیر حصہ
میں۔

اور اوابین کی پابندی تو سب ہی کرتے تھے یہی
اوابین کی پابندی کا نتیجہ تھا کہ میں نے کئی پارے یاد کر لئے
تھے۔ غرض "قوموا والناس نیام" پر عمل کی توفیق وہیں
ملی، آہ سحر گاہی کی لذت بھی وہیں ملی، طلبہ میں شب کے
اخیر حصہ میں اٹھنے کی ایک خاص لگن اور شوق تھا۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

شعر وردِ زبان رہتا تھا، اور علم و عمل میں ایک
دوسرے سے سبقت کرنے کی حرص تنافس کی شکل اختیار
کئے ہوئے تھی۔ ہتورہ کے بعد کسی اور مدرسہ کے طلبہ میں
یہ رنگ نہ دیکھا۔ اور مَن طلب العلیٰ سہر اللیالی کی جہد
اور کوشش بھی اس نوع کی کہیں اور نظر نہ آئی۔

ہتورہ کے بعد سہر اللیالی کی توفیق اس بے قدرے
سے سلب کر لی گئی ایسے ہی جیسے آہ سحر گاہی کی لذت سے بھی
محروم کر دیا گیا۔ پھر اگر رات میں جاگنا ہوا بھی تو کیا مدرسہ
اور کیا کالج ہر جگہ فضول مشاغل کے لئے۔ کیونکہ میری
طبیعت میں انفعال ہے جس جگہ گیا وہاں کے ماحول کا کچھ
نہ کچھ اثر پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ اعمال میں سستی ہوئی اور
ہوتی چلی گئی۔ جس جذبہ اور شوق کو لے کر علومِ دین کی
تحصیل کے لئے میں نے مدرسہ میں داخلہ لیا تھا اور اسکولی
تعلیم کو خیرباد کہا تھا جس کی بنا پر ماموں جی (مولانا عبدالرحمٰن
جامی، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) نے میرے تعارف
کے لئے لکھے گئے خط میں یہ جملہ بھی لکھا تھا۔ یہ بھی میری
طرح "معاجر من الانجلیزیہ الی العربیۃ" ہیں
اس کے پیشِ نظر تقاضہ بھی تھا کہ ہجرت الی العربیہ کاوشہ ہو
اور میری خواہش و شوق بھی کہ عربی علوم کی تعلیم و تعلم کو
میں اپنا مقصدِ حیات بناؤں، اور یہی وظیفۂ زندگی رہے
قوی توقع تھی کہ ایسا ہی ہوتا اگر حضرت مولانا کی تائید
اور اعتماد علیگڈھ جانے کے سلسلہ میں نہ ہوتی، علیگڈھ
جاکر بگڑ جانے کے اندیشہ کی تردید اور میری طرف سے
جس اطمینان کا اظہار حضرت مولانا نے برادرِ مکرم مفتی
زین الاسلام صاحب سے کر دیا تھا، وہی میرے لئے وقایہ
تھا۔

غرض ہتورہ میں گذارے گئے دو سال میرے لئے
سب سے عمدہ، سب سے قیمتی اور سب سے بابرکت ثابت
ہوئے حضرت کو تو پہلی اگست سنہ ۷۰ء شوال سنہ ۹۰ھ میں دیکھا
اور حضرت الشیخ شیخ العرب والعجم، مصلح، مربی، ھادی،
طریقت سب کچھ تھے لیکن میرے لئے حضرت مولانا کی
پہلی شبیہ حضرت الاستاذ کی تھی، پھر تو کتنے ہی مواقع
پیش آئے کہ حضرت سے علمی عملی زندگی سے متعلق مشورہ
کیا اپنا کچھ درد سنایا، تسلی ملی حوصلہ ملا، اعتماد بحال ہوا۔
اور زندگی با مقصد معلوم ہوئی، اصلاح حال کا خیال ہوا
تلافی مافات کی فکر ہوئی جب کبھی کسی قریب کی جگہ
کے متعلق معلوم ہوتا کہ حضرت تشریف لائے ہیں بس فوراً

جی چاہتا کہ چلنا چاہیئے، مل کر آنا چاہیئے۔

اسی سالِ رواں کے کسی مہینہ کی بات ہے کسی ضرورت سے نظام الدین جانا ہوا تھا وہاں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں۔ کسی صاحب کے یہاں تھوڑی دیر کے لئے گئے ہیں، کچھ دیر کے بعد آجائیں گے۔ دیر تک انتظار کیا!!۔ بہت دیر انتظار!!! مگر حضرت واپس نہیں آسکے۔ میں چلا آیا۔ اب سوچتا ہوں کیوں چلا آیا، ملاقات کر ہی کے واپس آتا۔ آہ! کسے معلوم تھا کہ ملاقات و زیارت اب کبھی نہ ہو سکے گی۔

حضرت کی وفات ہو گئی۔ واحسرتا! کسی طرح دل کو قرار نہیں کس سے تعزیت کروں؟ کیسے کروں؟ کہ مستحق تعزیت میں خود ہوں۔ اللہ رفع درجات فرمائے پسماندگان، متعلقین، محبین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آج حضرت فاطمہؓ کا یہ شعر کسی حد تک سمجھ میں آیا جو انہوں نے فخر دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہا تھا کہ مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اگر وہ مصیبتیں زمانہ پر ڈال دی جائیں تو دن اپنی روشنی کھو بیٹھے اور سیاہ ہو کر راتوں میں تبدیل ہو جائے۔

صبت علی مصائب لو انہا
صبت علی الایام صرن لیالیا

کہ کس قدر رنج وصدمہ انھیں رہا ہوگا۔

حضرت نے ہتورہ میں مدرسہ قائم کیا، اسکی ابتدا کیسے ہوئی؟ کس طرح وہ بڑھا۔ پنپا، پھلا پھولا، پروان چڑھا، اس کی تفصیل دوسرے مدارس کے پس منظر سے بالکل الگ ہے۔ وہاں کے لوگ جنگلی کہلاتے تھے حضرت کا بڑا کام یہ بھی ہے کہ حضرت نے ان کے نفس کی تہذیب کردی، ان میں دین اور علم دین کا شوق پیدا کر دیا، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا حافظ، ضامن اور دین کا خادم بنایا۔

اللہ تعالیٰ اس ادارے کی حفاظت فرمائے اور اسے حضرت مولانا کا کوئی اچھا سچا جانشین عطا کرے۔

(ص ۲۲ کا بقیہ)

انسانوں کا وہ سیلاب جو حضرت مولانا کی وفات کی ناگہانی خبر پاکر ہتھورا جیسے چھوٹے اور پسماندہ گاؤں میں امنڈ پڑا تھا وہ بھی اسی لئے کہ اپنی محبوب ترین شخصیت کا اس دنیا میں آخری دیدار کر سکے، اسکی نماز جنازہ میں شرکت کر سکے یا کم از کم اس کی قبر میں تین مٹھی مٹی ڈال کر ہی اسے خراج عقیدت پیش کر سکے۔

حضرت مولاناؒ کے علمی وروحانی مقام کا کچھ حال تو حضرات علماء وعارفین ہی بیان کر سکیں گے، راقم الحروف جیسا طالب علم تو اسے ان کی مقبولیت ہی کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان سے اپنا "خصوصی رشتہ" بیان کرنے والوں کی ایک ہوڑ لگ گئی ہے — کیونکہ مخلوق میں ایسی مقبولیت خالق کی نگاہ میں مقبول ہونے کی علامت ہوا کرتی ہے بات بالکل سچی اور دوٹوک ہے کہ ؎

موت اسکی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کیلئے

باندہ سے گورکھپور

مولانا محمد حمزہ صاحب گورکھپوری مدرس مدرسہ ریاض العلوم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ،

دن جا چکا تھا سورج غروب ہو گیا تھا ہم لوگ عشاء پڑھنے کے لئے مسجد جا رہے تھے، بھائی صاحب اسی وقت گورکھپور شہر سے تشریف لائے تھے ملاقات ہوتے ہی پوچھا کہ تم نے "قاری صاحب" کے متعلق سنا؟ عرض کیا نہیں تو! کیا کوئی خاص خبر ہے؟ کہا ہاں آج صبح تقریباً دس گیارہ بجے لکھنؤ میں حضرت قاری صدیق احمد صاحب کا انتقال ہو گیا.......

اتنی سادگی سے اتنی اہم خبر سنائی کہ دل کو تذبذب اور تردد کا موقعہ بھی نہ مل سکا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کرنٹ لگا ہو، ایک جھٹکا سا ہوا اور دل میں یہ یقین پیوست ہو گیا کہ واقعی "اندھیرا" پھیل گیا ہے اور "سورج" غروب ہو گیا ہے۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آہ! آج نمونۂ اکابر، بقیۃ السلف، عارف باللہ محبوب القلوب حضرت مولانا حافظ قاری شاہ صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ و برّد مضجعہٗ ہم سے جدا ہو گئے۔

یوں ہی یہ امت قحط رجال کا رونا رو رہی تھی اور ادھر چند سالوں میں پے در پے کئی صدمے سہہ چکی تھی کہ اچانک صفِ اول کے مردِ میدان بھی داغِ مفارقت دے گئے۔

آہ اس امت کی ڈولتی اور ڈوبتی ہوئی کشتی کی بے کسی اور بے بسی! ایک ایک کرکے ناخدا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں اور کشتی طوفان کے قریب بڑھتی جا رہی ہے۔

...... لیکن خدا جو پہلے بھی اس سفینہ کا محافظ تھا اور اب بھی وہی ہے۔ صرف اسی کا سہارا ہے۔

للہ ما اخذ وللہ ما اعطی

دراصل حضرت قاری صاحب کی شخصیت ایسی دل آویز اور محبت آمیز تھی کہ جس سے ادنیٰ التفات فرمالیتے وہ یہی سمجھتا تھا کہ آپ کو سب سے زیادہ تعلق مجھ ہی سے ہے، اور یہ وہ نبوی صفت ہے جو ہر ایک کے حصہ میں نہیں آیا کرتی ہے۔

احقر کو بھی حضرتؒ کے التفات و تعلق سے یہی امید بندھ گئی تھی اس لئے جب وفات کی خبر سُنی تو ایسا معلوم ہوا

جیسے دل میں قائم کوئی عمارت دھم سے گر گئی ہو اور اس کے نیچے تڑپتے بلبلاتے جذبات دم توڑنے لگے ہوں۔

اب اس وقت جبکہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے درمیان نہیں رہ گئے ہیں دماغ کے پردے پر ایک ایک باتیں اور یادیں ابھر کر آرہی ہیں اور دل کا تقاضا ہے کہ جو کچھ بن پڑے زیب قرطاس کردوں

کاوش کا دل تقاضا کرے ہے کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا۔

ممکن ہے کہ اس میں کوئی کام کی بات آجائے ورنہ کم ازکم یوسف کے خریداروں میں نام تو آہی جائے گا۔ اور یہ بھی بڑی سعادت ہے۔

پہلا تعلق جو شعور کے پردہ میں محفوظ ہے وہ اس وقت ہوا جب احقر مدرسہ جامع العلوم فیروزآباد میں ابتدائی عربی فارسی کے درجہ میں زیر تعلیم تھا۔ وہاں عم محترم استاد مکرم حضرت مولانا مفتی عبد العلیم علیمی صاحب مدظلہم مہتمم مدرسہ کا ایک مفید طریقۂ تربیت یہ دیکھنے میں آیا کہ جب کوئی طالب علم شرارت میں حد سے گذرنے لگتا اور کسی طرح قابو میں نہ آتا تھا تو اس سے چند جوابی پوسٹ کارڈ منگواتے پھر مشہور بزرگوں کی خدمت میں یہ مضمون لکھواتے کہ میں فلاں طالب علم فلاں مدرسہ میں پڑھتا ہوں دل نہیں لگتا ہے ایسی ایسی شرارت کرتا ہوں کسی طرح ٹھیک نہیں ہو پارہا ہوں دعا فرمادیں اور کوئی علاج تحریر فرمادیں، یہ خط جاتا اور جواب آتا اتنے دنوں میں طالب علم میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی شروع ہوجاتی تھی، کوئی بھی ہو طبیعت میں اگر ذرا بھی صلاحیت ہوتی تو یہ نسخہ ضرور اثر کرتا تھا۔

احقر کے سامنے ایک طالب علم کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو از خود یہ تحریک پیدا ہوئی کہ بزرگوں کی دعا لینے کا نہایت مختصر اور کم قیمت نسخہ ہاتھ آگیا ہے فوراً چند پوسٹ کارڈ لایا اور اس طرح کا مضمون بنا کر کہ احقر فلاں ابن فلاں ہے فلاں مدرسہ میں زیر تعلیم ہے۔ یہ کتابیں چل رہی ہیں، قرآن پاک کا حافظ ہے لیکن تلاوت کی توفیق نہیں ہو پارہی ہے شیطان کا غلبہ ہے اور ان ان امراض باطنی میں ابتلا ہے، دعا اور علاج کی درخواست ہے" بزرگوں کی خدمت میں روانہ کردیا، حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں بھی ایک کارڈ بھیجا تھا وہاں سے جواب جلد ہی موصول ہوا تحریر فرمایا۔

مکرمی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

دل سے دعا کرتا ہوں، ہر نماز کے بعد اول وآخر درود شریف گیارہ مرتبہ یا فتاح ایک سو پچیس بار پڑھ لیا کریں۔ والسلام صدیق احمد

دوسری مرتبہ پھر کبھی اسی طرح کا مضمون بھیجا تو بعینہٖ یہی جواب آیا پھر تیسری مرتبہ ایک لفافہ ارسال کیا اور جواب کے لئے پوسٹ کارڈ کے بجائے انتردیشی بھیجا دراصل خط کا مضمون ایک خواب پر مشتمل تھا اس لئے یہ تبدیلی ہوئی تھی جواب آیا۔

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خط ملا، دعا کرتا ہوں خواب کی تعبیر مجھ کو نہیں آتی

حضرت مفتی محمود الحسن صاحب مدظلہٗ سے دریافت کرلیں

والسلام صدیق احمد

اپنی طرف سے اگرچہ تعلق کی ابتدا ہوگئی تھی لیکن زیارت و ملاقات کی نوبت اب تک نہیں آئی تھی۔

فیروز آباد میں ایک ہی سال قیام رہا، اسی سال کی بات ہے کہ مدرسہ میں سالانہ جلسہ تجویز ہوا، حضرت قاری صاحبؒ تو جلسوں کی روح اور رونق تھے، حضرت کو دعوت دی گئی منظور فرمالیا آپ یوں بھی کسی کی دعوت رد نہیں فرماتے تھے۔ عام سے عام مسلمان جو ضرورت چاہتا پوری کرالیتا تھا۔ لفظ "نہیں" اور انکار آپ نے اپنی لغت سے خارج فرمار کھا تھا۔ پھر یہاں تو معاملہ چچا جان کا تھا جن کے لئے حضرت صرف ایک بزرگ اور شیخ ہی نہیں تھے بلکہ ایک شفیق بھائی اور سرپرست بھی تھے۔ اس لئے منظور نہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

احقر کو زیارت کا اشتیاق تو تھا ہی اب آمد کی خبر سُن کر انتظار بھی شروع ہوگیا، خدا خدا کر کے جلسہ کی تاریخ آئی معلوم ہوا کہ رات میں تشریف لائیں گے۔ لیکن رات میں جب تاخیر ہونے لگی تو خیال ہوا شاید صبح آویں اس لئے صبح کا خیال لئے سو گئے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ رات میں گیارہ بجے تشریف لائے تھے، اور وقت میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی دیر رہ کر دو بجے واپس تشریف لے گئے۔ اللہ اکبر! وعدہ اور نسبت کا اتنا لحاظ کہ مختصر سے وقت کے لئے اتنا طویل سفر برداشت کرلیا تاکہ صحت، روپیہ، وقت اور آرام سب قربان ہوجائے لیکن وعدہ کا بھرم اور نسبت کا پاس باقی رہ جائے اس پر آنچ نہ آنے پائے۔

یاد آیا کہ خالو ئے محترم حضرت مولانا عمار احمد صاحب مدظلہم کے وہاں بھی سالانہ جلسوں میں حضرت کی شرکت لازمی سی ہوکر رہ گئی تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ حضرت ہی جلسہ کا مدار بن گئے تھے، تو غلط نہ ہوگا، ایک مرتبہ عین جلسہ سے قبل افریقہ کا سفر پیش آگیا لوگوں نے اڑا دیا کہ حضرت کی تشریف آوری نہ ہوسکے گی مگر وعدہ کے پاس و لحاظ میں نبوی صفت کے حامل ان بزرگ نے اولاً افریقہ کا سفر منظور ہی اس شرط پر کیا کہ افضل المعارف کے جلسہ سے پہلے پہونچا دیا پھر وہاں بھی روز روز ڈائری دیکھ کر تقاضا فرماتے رہے کہ جلدی پہونچا، جلسہ کی تاریخ قریب آچکی ہے آخر شرکت فرما کر اطمینان کا سانس لیا۔

بات وعدہ کی نکل آئی ہے تو ایک واقعہ یاد آیا کہ بھائی صاحب نے فراغت کے بعد اپنے قصبہ کیمپیر گنج میں کپڑے کی ایک دوکان شروع کی تھی، کیمپیر گنج گورکھپور شہر سے نیپال کے راستہ پر ۲۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے کسی ملاقات پر بھائی صاحب نے گھر کے لئے دعوت دیتے ہوئے حضرت سے عرض کیا ہوگا کہ ایک دوکان شروع کی ہے حضرت تشریف لے چلیں اور دعا فرمادیں اس وقت فرصت نہ ہونے کی وجہ سے عذر فرمادیا، پھر بھائی صاحب کا بیان ہے کہ گرمی کا زمانہ تھا ایک دن ٹھیک دوپہر میں دوکان کے ٹھیک

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرتِ قاری صاحب کی ذات سے مسلمانوں نے اس بڑے پیمانے پر فائدہ اٹھایا اور دنیاوی مقصد پورا کرایا، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے اتنے ہی بڑے پیمانہ پر اس ذات گرامی کی ناقدری کی کہ جس کے ذریعہ دائمی عاقبت سنور سکتی تھی اس سے چند روزہ دنیا کا فائدہ اٹھایا اور جس سے خدا تک رسائی ہو سکتی تھی انکو حقیر دنیا کے حصول کا ذریعہ بنا لیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے کئی مرتبہ سنا کہ حضرت قاری صاحبؒ بمبئی تشریف لے جاتے تو لوگ اتنا ہجوم کرتے تھے کہ بالکل پیس کر رکھ دیتے تھے، ایک مرتبہ تشریف لائے جیسے ہی مسجد سے نکلے لوگ ٹوٹ پڑے نہ راستہ کا خیال نہ بڑے بوڑھوں کا اور نہ ایک دوسرے کی ایذا دہی کی پرواہ حتیٰ کہ خود حضرت قاری صاحبؒ کا بھی لحاظ نہیں رہ گیا تھا بس فکر تھی تو یہی کہ کس طرح حضرت پر گر پڑو، اور بدن کو مس کر لو چاہے کچھ ہو جائے جب معاملہ حد سے گذر گیا تو چند قوی اور تنومند حضرات نے ہاتھوں کا حلقہ بنا کر بمشکل کار تک پہونچایا تب آپکو نجات ملی۔

فرمایا کہ جب اپنی قیام گاہ پر پہونچ گئے تو میں بھی ملنے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ اس وقت قلم کاغذ لئے تعویذ لکھ رہے تھے مجھ کو دیکھتے ہی رکھ دیا اور مزاحاً فرمایا کہ "یہ مفتی صاحب ہیں ابھی کہہ دیں گے کہ ناجائز ہے" پھر مجھ سے فرمایا کہ لوگ جمع ہیں کچھ بیان کر دیجئے میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ ارشاد فرمائیں فرمایا کہ میں مجلس میں نہیں بول پاتا ہوں ممبر پر تو کچھ کہہ بھی لیتا ہوں اس لئے آپ ہی بیان کیجئے حضرت مفتی صاحبؒ نے تعمیلاً للحکم تقریر شروع فرمائی جو تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی جس کی ابتدا یہاں سے فرمائی کہ

"حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر پیر بنانے سے خدا تک رسائی نہ ہوئی تو پیر کو پکڑنا ایسا ہی ہے جیسے اس ستون کو پکڑ لینا اور فرماتے تھے کہ تم لوگ ہمارے جسم پر گرنا چاہتے ہو تو جسم پر گرنے سے کچھ نہیں ہوگا وہ بات حاصل کرو جس کی وجہ سے یہ مقام ملتا ہے تو یہ اصل فائدہ ہے"۔

پھر آگے فرمایا کہ:۔

"قرآن پاک میں ہے ادعونی استجب لکم تم لوگ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا تو جب قرآن پاک میں براہ راست ہر مسلمان کو مانگنے کا حکم دیا گیا ہے اور قبولیت کا وعدہ فرمایا گیا ہے تو پھر واسطہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ براہ راست کیوں نہیں مانگتے؟ آخر جو خدا ان بزرگ کا ہے وہی تمہارا بھی تو ہے۔ یہی چیز شرک بن جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی دوسرے کو اتنا مؤثر سمجھ لیا جائے کہ ان کا کہنا خدا تعالیٰ نہیں ٹال سکتے"۔

غرض اسی طرح کا مضمون تھا حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بیان سے بہت مسرور اور محظوظ ہوئے اور

فرمایا کہ اسکو ممبر پر عام مجمع میں بیان ہونا چاہیے کیوں کہ حضرت کو بھی عام مسلمانوں سے یہی شکایت تھی۔

بات فیروز آباد کے زمانۂ قیام کی چل رہی تھی اسی سال کی بات ہے کہ احقر کے تائے ابا حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس صاحب رومی مدظلہم مفتی شہر آگرہ نے اپنی صاحبزادی کے نکاح میں حضرت کو آگرہ آنے کی دعوت دی، وہاں تو انکار نام کی چیز ہی نہیں تھی پھر یہ معاملہ حضرت رومی صاحب کا تھا جو غالباً مظاہر علوم میں حضرت کے رفیقِ درس رہ چکے تھے اور حضرت سے نہایت دوستانہ اور برادرانہ تعلقات رکھتے تھے اس لئے حضرت نے منظور فرمالیا اور آگرہ تشریف لائے احقر بھی اس موقعہ پر حاضر تھا اس لئے غالباً سب سے پہلی زیارت و ملاقات کا شرف اسی وقت آگرہ میں ہوا ؎

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ایک سال فیروز آباد میں رہ کر گورینی کے لئے رختِ سفر بندھ گیا۔ یہاں پہونچے تو نحو میر کی جماعت میں داخل ہوا پھر یہیں افتاء تک تعلیم مکمل ہوئی اور یہیں اپنے اساتذہ کی جوتیوں میں جگہ بھی مل گئی۔ فللہ الحمد۔

اس دوران حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیسیوں مرتبہ زیارت ہوئی اور عجیب عجیب واقعات دیکھنے یا سننے میں آتے رہے کوئی کہاں تک سب کو بیان کرسکتا ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار

اس وقت جی چاہتا ہے کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گورینی سے دلچسپی اور حضرت گورینی سے آپ کے تعلق خاطر کو مختصراً ذکر کردیا جائے کہ نہ جانے پھر یہ موقعہ ملے یا نہ ملے۔

گورینی میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلچسپی اور کشش کا مرکز اول حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب دامت برکاتہم کی ذاتِ گرامی تھی، حضرت قاری صاحب آپ کو اپنے اکابر میں شمار فرماتے تھے اور جب بھی تشریف لاتے تو ایسی تواضع اور ادب کا برتاؤ فرماتے تھے کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اپنے وقت کا ایک مسلم بزرگ جس کی مقبولیت اور محبوبیت اللہ تعالیٰ نے ہر کہ ومہ کے دل میں اتار دی تھی۔ بایں اوصاف عالی دوسرے بزرگ کی خدمت میں اس تواضع عاجزی اور سکینت کے ساتھ پیش آسکتا ہے۔

گورینی میں پہلا منظر جو ان دونوں بزرگوں کے ملاقات کا ان آنکھوں نے دیکھا وہ عجیب حیرت ناک تھا حضرت مولانا دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، قاری صاحب تشریف لائے، شور ہوا کہ قاری صاحب تشریف لائے ہیں احقر بھی شوق میں دوڑا ہوا حاضر ہوا اور سیدھا دفتر میں جا گھسا دیکھا کہ حضرت مولانا مسند نشین ہیں اور حضرت قاری صاحب حضرت کے سامنے باادب بیٹھے ہوئے ہیں احقر بھی ایک گوشہ میں بیٹھ گیا، کچھ لمحہ گذرا تھا کہ حضرت قاری صاحبؒ نے حضرت مولانا کے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا حضرت نے فوراً سمیٹ لیا لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے

باصرار اسی حالت میں دبانا شروع فرمادیا، احقر حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ان بزرگ میں نفس نام کی کوئی شے بھی پائی جاتی ہے؟ اور کیا کبر خودی انہیں چھو کر گذری ہے؟۔

غرض جب قاری صاحب کسی طرح مانے نہیں اور دبانا شروع کر دیا تو حضرت مولانا نے فرمایا یہ کیا بدعت آپ نے شروع کردی، قاری صاحب نے فرمایا "نِعْمَتِ الْبِدْعَۃُ" حضرت مولانا نے فرمایا کہ مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بدعت نعمت اور حسنہ ہو ہی نہیں سکتی بدعت کی توصرف ایک ہی قسم ہے یعنی سیئہ اور اگر حسنہ ہو تو بدعت کہاں ہے؟ جواب میں قاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کچھ فرمایا لیکن احقر سن نہ سکا کچھ دیر اور مجلس رہی پھر قاری صاحب کی واپسی ہوگئی، احقر نے یہ پہلا منظر حضرت مولانا سے تعلقات اور ملاقات کا دیکھا تھا اس سے پہلے نہ جانے کب سے اور کیسے تعلقات اور معاملات تھے وہ نہ احقر جانتا ہے اور نہ اب معلوم ہونے کی کوئی صورت ہے، البتہ ایک مرتبہ حضرت مولانا سے احقر نے یہ پوچھا کہ کیا حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قیام مظاہر کے دوران آپ سے کوئی کتاب پڑھی ہے؟ کیونکہ بعض حضرات سے سنا ہے کہ حضرت نے مختصر المعانی خارج اوقات میں آپ سے پڑھی تھی؟ تو پہلے تو حضرت پر گریہ طاری ہوگیا پھر فرمایا کہ نہیں تو! مجھے تو یاد نہیں ہے۔ بلکہ مجھے مظاہر کے قیام کے دوران قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنا بھی یاد نہیں ہے!۔

جب حضرت مولانا نے یہ فرمادیا تو احقر کو یہ خیال ہوا کہ واقعی حضرت مولانا اور حضرت قاری صاحب کا اجتماع مظاہر میں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ حضرت مولانا نے حضرت مولانا عبد اللطیف کے دور میں پڑھا ہے، اور آپ حضرت مفتی محمود الحسن صاحب کے رفقاء میں سے ہیں جبکہ حضرت قاری صاحب نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے دور میں پڑھا ہے۔ اور آپ حضرت مفتی صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں۔

پھر حضرت مولانا نے فرمایا کہ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات کب ہوئی یہ تو یاد نہیں قاری صاحب حضرت فتحپوری رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں آتے تھے مگر اس وقت میرا کوئی تعارف نہ تھا بہت سے لوگ آتے جاتے تھے مجھ سے کسی سے کیا لینا دینا تھا؟ پہلا تعارف جو ہوا ہے وہ جھانسی میں اجتماع کے موقع پر ہوا۔ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے تھے میں بھی حاضر ہوا تھا اس وقت قاری صاحب کو چکر آرہا تھا ایک حجرہ میں کنارے لیٹے ہوئے تھے حضرت جی بھی تھے میں نے بے تکلفی برتتے ہوئے کہا کہ آخر آپ کو آنے ہی کی ضرورت کیا تھی؟ آرام کئے ہوتے تو ہنسے، پھر دوسری مرتبہ دہلی میں مرکز میں ملاقات ہوئی تو مجھ کو دعوت دی کہ باندہ آیئے! میں نے کہا باندہ پتہ نہیں کہاں ہے مجھے اس کا راستہ ہی معلوم نہیں ہے، فرمایا آپ تشریف لایئے راستہ معلوم ہوجائے گا الٰہ آباد سے "بدلی کھنڈ ایکسپریس" ٹرین پر بیٹھے، شام کو الٰہ آباد سے چلتی ہے اور بارہ بجے

باندہ پہونچتی ہے، باندہ میں میں خود موجود رہوں گا میں نے کہا کیا رات کے بارہ بجے آپ خود اسٹیشن پر رہیں گے فرمایا جی ہاں میں خود رہوں گا، پھر میرا سفرطے ہوگیا یہاں سے الٰہ آباد پہونچا وہاں سے شام کو ٹرین پر بیٹھا اور بارہ ساڑھے بارہ بجے باندہ پہنچ گیا قاری صاحب رحمۃ اللہ خود موجود تھے فوراً ہی کار میں بٹھا کر شہر ہی میں ایک صاحب کے گھر لے گئے وہاں پہلے سے انتظام تھا تھوڑی دیر بعد مٹھائی اور چائے وغیرہ لائی گئی طبیعت میں چونکہ تکلف ہے فوراً کسی سے دوستی نہیں ہو پاتی ہے اس لئے میزبان سے میرا کوئی تعارف نہیں ہو سکا بس قاری صاحب ہی کی طرف متوجہ رہا، میں نے پوچھا کہ قاری صاحب یہ کھانے کی کونسی قسم ہے؟ تو مسکرا کر فرمایا حضرت سحری سمجھ لیجئے میں نے کہا کہ پھر سحری کے بعد والی چیز تو نہیں کرنی پڑیگی تو ہنسے اور کہا جی نہیں روزہ نہیں رکھنا ہوگا! پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی فجر کی اذان ہوگئی نماز پڑھ کر باندہ سے ہتورہ کی طرف چلے ہتورہ میں دن بھر قیام رہا اگلے دن واپسی ہوئی، صاحبزادہ محترم جناب مولانا عبدالرحیم صاحب بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔

پھر کافی دنوں کے بعد دوبارہ مرکز میں ملاقات ہوئی تو قاری صاحب نے پھر دعوت دی اور اس بار بھی حضرت مولانا کے ساتھ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کو مدعو کرنا چاہا تو فرمایا کہ میں مولانا عبدالرحیم صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ ساتھ میں آویں، حضرت مولینا نے فرمایا کہ خط لکھنے کی ضرورت نہیں ہے میں کہہ دوں گا اور ساتھ میں لاؤں گا، حضرت مولانا کا دوسرا سفر باندہ کے لئے تھا، اور یہی آخری بھی تھا، اسکے بعد باندہ جانے کی نوبت نہیں آئی۔

اس دوسرے سفر میں ایک خاص واقعہ بھی پیش آیا جو طوالت کے خوف سے مؤخر کیا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ ان دونوں حضرات میں جانبین سے ایک ایسا خصوصی تعلق تھا جو خاص طور پر ہمارے اکابر کا طرۂ امتیاز رہا ہے حضرت قاری صاحب نے جیسا ادب اور تواضع کا برتاؤ فرمایا وہ سب پر ظاہر ہے، وفات کے بعد جب حضرت مولانا نے حضرت قاری صاحب کا تذکرہ فرمایا تو ہر مرتبہ "رحمۃ اللہ علیہ" کے ساتھ نام لیا اور اس کا اتنا اہتمام کیا کہ حیرت ہوگئی ؎

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلہم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

بات گورینی کی شروع ہوچکی ہے حضرت مولانا دامت برکاتہم کا جو تعلق علم میں تھا عرض کر دیا گیا، مگر حضرت قاری صاحبؒ کا یہاں سے تعلق اتنے ہی پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ ؎

ابھی اور ہیں آسماں اس زمیں پر

حضرت قاری صاحب کی دلچسپی اور تعلق کا ایک قوی سبب اور بھی یہاں موجود تھا اور وہ ہے استاذ الاساتذہ فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد حنیف صاحب دامت برکاتہم کی شخصیت حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے استعداد میں پختگی، فنون میں مہارت، فقہ سے خصوصی مناسبت،

اور حضرت فتحپوری سے نسبت کے ساتھ ساتھ جو خاص اوصاف عطا فرمائے ہیں مثلاً خمول پسندی، فضولیات سے احتراز، ناغہ اور فرض منصبی میں کوتاہی سے اجتناب دقیق مباحث پر قابو پھر قوتِ تفہیم کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مختصر سے لفظوں میں سمیٹ کر مخاطب کے ذہن میں اتار دینا وغیرہ یہ سب چیزیں حضرت قاری صاحب جیسے جوہر شناس اور قدر داں کے لئے بڑی کشش کا ذریعہ بن گئی تھیں، آپ نے اپنے اساتذہ میں یہ اوصاف دیکھے تھے۔ پھر انقلابِ زمانہ نے جب مدارس میں بھی انقلاب اور سیاست داخل کر دی تو آہستہ آہستہ یہ اوصاف ختم ہوتے گئے ایسا لگتا تھا جیسے قاری صاحب کی آنکھیں ترس گئی ہوں ان اوصاف و کمالات سے آراستہ اساتذہ کیلئے اسی لئے جہاں کہیں سُن پاتے فوراً اس کی طرف لپکتے تھے جب حضرت مفتی صاحب میں آپ کو اسکی جھلک واضح طور پر نظر آئی تو حضرت قاری صاحب کے دل میں آپ کی محبت اور قدر پیوست ہو گئی ؎

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ مفتی صاحب کے گلے میں نہایت خطرناک کینسر ہو گیا تھا بچنے کی امید ختم ہو گئی تھی اسی دوران کو پاگنج کے قاری نسیم صاحب نے قاری صاحب سے ملاقات کی اور یہ اطلاع بھی پہونچا دی ان کا بیان ہے کہ قاری صاحب بالکل بے چین ہو گئے اور اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا، اور بار بار فرماتے جا رہے تھے کہ "اب کیا ہوگا یہی دو چار پڑھانے والے تھے یہ ختم ہو جائیں گے پھر کیا ہوگا؟

پھر اللہ کے نہایت فضل و کرم اور اکابر کی دعاؤں کی برکت سے مفتی صاحب کو صحت ہو گئی

جب قاری صاحب اس کے بعد گورینی تشریف لائے تو مائل بصحت دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور سب کے سامنے فرمایا کہ "جتنا میں آپ کے لئے رویا ہوں اتنا کسی کے لئے نہیں رویا"۔

حضرت مفتی صاحب سناتے ہیں کہ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک جگہ میرا بیان ہونے والا تھا حضرت قاری صاحب بھی وہاں موجود تھے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "تم لوگ ان کا وعظ سنو یہ وہاں (یعنی اوپر آسمان) سے واپس آئے ہیں"۔

حضرت مفتی صاحب کی کئی ملاقاتیں حضرت قاری صاحب سے بمبئی میں بھی ہوئیں جس کی وجہ یہ ہوئی کہ کینسر کی شکایت کے بعد ڈاکٹروں کا تاکیدی مشورہ ہے کہ ہر چھ ماہ پر جانچ ضروری ہے کیونکہ اس مرض کے لوٹ آنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے آپ ہر چھ ماہ پر تعطیل مدرسہ کے اوقات میں بمبئی تشریف لیجاتے ہیں اور ہفتہ عشرہ قیام کے بعد واپسی ہو جاتی ہے البتہ اس دوران اہل بمبئی اپنی سعادت کی وجہ سے خوب ہی خوب استفادہ کرتے ہیں، اور ماشاء اللہ مفتی صاحب کی مقبولیت اور محبوبیت وہاں روز افزوں ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ

یکسوئی اور پابندی پر یاد آیا کہ ایک مرتبہ بمبئی ہی میں ایک صاحب کے یہاں دعوت تھی جس میں اکابر میں سے حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب دامت برکاتہم

اور حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ بھی شریک تھے۔ حضرت مفتی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ یہ وہی طبیعت کی ناسازی کے بعد شروع شروع میں بمبئی کا سفر ہوا تھا۔ حضرت قاری ولی اللہ صاحب امام مسجد "النور" نے ایک صاحب سے مفتی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ یہ حضرت فتحپوری کے شاگرد اور ان کے مجاز بیعت ہیں گوریگاؤں کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں ...... ابھی وہ یہ سب بیان ہی کر رہے تھے کہ قاری صاحب نے فرمایا کہ "ابجی یہ سب تو اور بھی مل جائیں گے یہ بتاؤ کہ ایسا مدرس کہاں ملے گا جس نے پچاس سال سبق پڑھایا ہو اور ناغہ نہ کیا ہو ایسا کوئی مدرس تو لاؤ"۔

اور اسی وجہ سے جب مفتی صاحب سے ملتے تھے تو یہ بھی فرماتے تھے کہ:۔

"آپ اپنے جیسا کوئی آدمی ہم کو بھی دیجئے"۔

یہ تھی حضرت قاری صاحب کے دل میں حضرت مفتی صاحب کی قدر و منزلت۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ حضرت قاری صاحب میں بھی یہ اوصاف موجود تھے۔ اور آپ کی آنکھیں درحقیقت ایک سچے جوہری کی آنکھیں تھیں جو اصلی ہیرے کی جوت کو دیکھنے کے لئے کسی آلہ اور ظاہری دلیل کی محتاج نہیں تھیں۔

یوں تو یہاں کے کئی حضرات ایسے ہیں جنہوں نے حضرت قاری صاحب کے مبارک و میمون دل میں قدر و منزلت کا شرف پا رکھا تھا، استاد القراء حضرت مولانا قاری اسماعیل صاحب مدظلہم کا تو باقاعدہ تعلق ہی تھا اور ہر سال قرأت و تجوید کے امتحان کے لئے بلائے بھی جاتے تھے، اسی طرح آپ استاد محترم حضرت مولانا سعادت علی صاحب قاسمی مدظلہم کی قدر بھی فرماتے تھے کسی سے سنا ہو گا کہ استاد محترم نہایت پابندی سے بلا ناغہ اسباق پڑھاتے ہیں، اور متقدمین کے طرز کے مطابق سبق کی تقریر نہایت سادہ اور مختصر فرماتے ہیں۔ جبکہ خود حضرت قاری صاحبؒ کا بھی یہی معمول تھا، اس لئے متاثر اور مسرور ہوئے، اور یہی وجہ تھی کہ اس مدرسہ کے مولوی حافظ اشرف صاحب سلطان پوری جو حضرت سے خاص نسبت اور تعلق رکھتے تھے بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سلطان پور تشریف لائے تھے تو صرف حضرت مولانا سعادت علی صاحب مدظلہٗ کو خاص طور پر پوچھا کہ کون سی کتابیں پڑھاتے ہیں اور کیسے پڑھاتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ دل میں کچھ خیال تھا تبھی تو بالکل بے موقع اور بے سان و گمان یہ تذکرہ فرمایا لیکن حضرت کی توجہ اور شفقت کا خصوصی شرف ہمارے مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مدظلہٗ (صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب دامت برکاتہم) نے پایا تھا۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ۔

"ناظم صاحب" میں کئی چیزیں جمع ہو گئی تھیں، ایک تو والد صاحب کی نسبت ہی توجہ اور کشش کیلئے کافی تھی اس پر مستزاد تقویٰ، احتیاط و تدبر و انتظام کے ساتھ تواضع اور جفاکشی جیسے اوصاف جو کسی بھی اللہ والے کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کافی تھے۔ پھر حضرت قاری صاحب جو خود بھی ان اوصاف کے حامل، دلدادہ اور بڑے قدرداں تھے کیوں نہ متوجہ ہو جاتے۔

حضرت کو اپنے وہاں جنریٹر لگوانا تھا یہاں کا سلیقہ اور حسن انتظام دیکھ چکے تھے اس لئے ناظم صاحب سے فرمایا کہ باندہ آیئے اور اس سلسلے میں مشورہ دیجیے۔ ناظم صاحب نے محترمی جناب امانت صاحب مدظلہ کا حوالہ دیا کہ انہی کی زیر نگرانی یہاں لگا ہے لہٰذا ان کا مشورہ ہی مناسب ہوگا مگر قاری صاحب نے باصرار ناظم صاحب کو بھی دعوت دی آخر دونوں حضرات پہونچے اور پھر انہی حضرات کے مشورہ کے مطابق جگہ کا انتخاب ہوا اور سارا انتظام طے پایا۔

ایک روایت بزمانۂ طالب علمی سنی تھی کہ جب حضرت قاری صاحب نے ناظم صاحب کے متعلق یہ سنا کہ مدرسہ کے ہر انتظام میں خود بھی شرکت کرتے ہیں حتی کہ جب بیت الخلاء میں صفائی کی ضرورت ہوئی اور کوئی انتظام نہیں ہو پایا تو خود ہی صفائی پر آمادہ ہو گئے تو بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ "ناظم ہو تو ایسا ہو"۔

اتفاق یہ کہ حضرت ناظم صاحب بھی باندہ سے واپسی پر اسی تاثر کے ساتھ لوٹے تھے کہ حضرت قاری صاحب مدرسہ کے ہر انتظام میں بنفس نفیس شریک رہتے ہیں حتی کہ سبزی خریدنے اور کاٹنے میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

اس پر یاد آیا کہ باندہ کے ایک قدیم طالب العلم نے تو ایک عجیب واقعہ سنایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک طالب العلم کی چپل ٹوٹ گئی تھی قاری صاحب نے فرمایا کہ لاؤ اپنی چپل بھی دو اور دوسرے طلبہ میں سے جس کی چپلیں ٹوٹی ہوں وہ بھی لاؤ پھر تھیلا بھر کر کے چپل لے کر باندہ گئے اور خود بنوا کر لائے، اللہ اکبر: تواضع اور بے نفسی آپ پر ختم تھی۔ ~~~

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم

ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب مئو تشریف لائے تھے ناظم صاحب کو معلوم ہوا تو اسلم بھائی کو لے کر کرایہ کی جیپ کر کے زیارت کے لئے حاضر ہوئے وہاں جس مکان میں قیام کا نظم تھا صاحب خانہ نے حضرت کے لئے انتہائی اندرونی کمرے میں (جہاں محاورۃً پرندہ بھی پر نہ مار سکے) نظم کیا تھا حتی کہ خواص کا انتظام بھی دوسرے کمرے میں تھا مگر جب کھانا لایا گیا تو چونکہ حضرت نے ناظم صاحب کی جھلک دیکھ لی تھی اس لئے ہاتھ روکے رہے جب تک ناظم صاحب کو بلوا نہیں لیا اس وقت تک کھانا شروع نہیں فرمایا پھر وہاں سے آگے سفر کے لئے بھی دوسرے لوگوں کو روک دیا اور فرمایا کہ اب انھیں کی گاڑی میں سفر کروں گا تم لوگ رہنے دو۔

اسی طرح سلطان پور میں مولوی حافظ اشرف صاحب کے نکاح میں حضرت نے شرکت فرمائی ناظم صاحب بھی پہونچے تھے دیکھ لیا، تو پھر جب کھانے کے لئے بیٹھے تو ایک ہاتھ سے جگہ روکے رہے، ایک صاحب نے وہاں بیٹھنا بھی چاہا مگر انہیں ہٹا دیا اور پھر ناظم کو بلا کر بٹھایا، کھانے کے بعد ساتھ چلنے کو فرمایا تو ناظم صاحب نے عذر کر دیا، پھر آرام کے لئے جیپ سے مولوی اشرف صاحب کے مکان کی طرف چلے جو کافی فاصلہ پر تھا تو راستہ میں ڈرائیور نے جس نے ناظم صاحب کے ساتھ حضرت کا یہ برتاؤ دیکھا تھا پوچھا کہ آپ حضرت کے رشتہ دار لگتے ہیں؟ ناظم صاحب نے مزاحاً کہا ہاں میں باپ کے نام کی روٹی کھاتا ہوں"۔ وہ یہ جواب نہیں سمجھا تو پھر بتلایا کہ فلاں کا بیٹا ہوں جو فلاں کے خلیفہ ہیں اور حضرت قاری صاحب فلاں

کے خلیفہ ہیں اس طرح وہ میرے چچا ہوتے ہیں تو اس نے
کچھ سمجھا پھر اپنا ایک عجیب واقعہ بتلایا کہ پہلے میں بدعتی خیال کا
تھا دیوبندی وہابیوں کا پورا مخالف تھا مگر ہوا یہ کہ الہ آباد
میں ایک مجذوب رہتے تھے، ہم لوگوں کو ان سے عقیدت تھی
انہی کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور اپنی مرادیں مانگتے تھے۔
ایک دن ایسے ہی پیچھے پیچھے چل رہے تھے کہ اچانک مڑے
اور تیز لہجہ میں کہا کہ میرے پیچھے کیا پھرتا ہے باندہ جا باندہ
وہاں ایک شخص رہتا ہے وہ - ہے" یعنی وہ کچھ ہے جب
مجذوب صاحب نے یہ کہدیا تو چونکہ عقیدت تھی اس لئے
باندہ جانا پڑا پھر حضرت سے تعلق کے بعد اپنا پچھلا سب
مذہب بھی بدل دیا۔

اسی سال کی بات ہے کہ ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب
الہ آباد اسٹیشن سے گذر رہے تھے احقر ملاقات کے لئے
اسٹیشن حاضر ہوا تو مختصر سے وقت میں اور گفتگو کے بعد
فرمایا کہ "ناظم صاحب سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ پان
کھانا چھوڑ دیں احقر نے عرض کیا کہ وہ تو چھوڑ چکے ہیں تو
بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تب میں ان کو مٹھائی کھلاؤں
گا۔ پھر فرمایا کہ اچھا کہدینا کہ خود ہی منگا کر میری طرف سے
کھالیں" احقر نے ناظم صاحب سے آکر عرض کیا تو فوراً جیب
سے روپیہ نکال کر دیا کہ جاؤ ابھی لیتے آؤ احقر لایا اور ناظم
صاحب نے یہ فرمائش فوراً پوری کر دی۔

اس پر لطیفہ یہ ہوا کہ جب یہ قصہ حضرت مولینا
عبد الحلیم صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں عرض کیا تو مزاحاً
فرمایا کہ اگر قاری صاحب رحمۃ اللہ حیات ہوتے تو میں کہلاتا
کہ کھانے والے اور کھلانے والے دونوں بخیل تھے کہ
انہوں نے صرف ناظم صاحب کو کھلایا اور انہوں نے بھی تنہا
کھالیا آخر میں بھی تو یہاں تھا۔

غرض حضرت ناظم صاحب سے بھی حضرت قاری
صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خاص لگاؤ اور تعلق تھا ایسا
تعلق جو ناظم صاحب کے لئے بھی اور مدرسہ کے لئے بھی سرمایۂ
افتخار ہے مگر افسوس کہ اب وہ بساط ہی الٹ گئی

•

گورینی آنے کے بعد تو حضرت قاری صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کی بار بار زیارت وملاقات کا شرف
حاصل ہوا، البتہ حاضری کا موقعہ نہیں مل پارہا تھا، حسن
اتفاق سے یہ سعادت بھی حاصل ہوگئی وہ اس طرح کہ حضرت
کے رفیق خاص احقر کے نانا ابا حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب
جامی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد آپ کے اکلوتے صاحبزادے
برادر محترم مولانا محی الدین صاحب جامی کا نکاح باندہ کے
شیخ الحدیث وصدر مدرس حضرت مولانا نفیس اکبر صاحب
مدظلہم کی صاحبزادی سے طے پایا جس میں حضرت قاری
صاحب دونوں طرف کے سرپرست تھے دولہا کے ساتھ
جانے والوں کی تعداد خاصی ہوگئی تقریباً ۳۰ یا ۳۲ نفر
کا قافلہ تیار ہوگیا اس لئے ایک منی بس سے سفر تجویز ہوا
جب بس طے ہوگئی تو اس احقر کی جگہ بھی نکل آئی۔ مقصود
احقر کا بھی اور ساتھ کے اکثر حضرات کا حضرت قاری صاحب
اور آپ کے دیار کی زیارت تھی اور تعداد میں اضافہ کی
اصل وجہ بھی یہی تھی پس بظاہر یہ بارات تھی مگر اسکا دولہا

وہ تھا جو باندہ میں پہلے سے فروکش تھا۔ حاضری ہوئی اور حضرت کو حضرت کے اصل مقام پر دیکھا اور حضرت کے در و دیوار اور آپ کے لگائے چمن زار کو شوق کی نگاہوں میں بسایا پھر واپسی ہوگئی۔

نازم بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ایک مرتبہ تمرین افتاء کے اخیر سال میں تشریف لائے حضرت مفتی صاحب کے کمرے سے نکل رہے تھے تب احقر پہنچا طلبہ کی ایک بھیڑ ساتھ میں تھی بہت محبت اور شفقت کے ساتھ مصافحہ فرمایا پھر فرمایا تمہاری شادی ہوگئی؟ عرض کیا ابھی نہیں، فرمایا کروگے؟ میں شرم کی وجہ سے خاموش رہا پھر فرمایا اگر میں رشتہ کرادوں تو منظور کرلوگے؟ میں چپ ہی رہا، جواب سمجھ میں نہیں آرہا تھا آخر جب تیسری بار پوچھا تو احقر نے ادب سے عرض کردیا کہ یہ معاملہ حضرات والدین کی مرضی پر ہے جیسا وہ حضرات کہیں گے وہی ہوگا! حضرت اس دوران نہایت شگفتہ رہے تھے، اور احقر شرم کی وجہ سے اپنے آپ میں نہیں رہ گیا تھا۔ حضرت حسبِ معمول تھوڑی دیر کے بعد واپس ہوگئے۔

پھر یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت نے جو تائے ابا حضرت جامی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے آپ کے خاندان کے سرپرست بن گئے تھے۔ (اور یوں تو ہم سبھی کے سرپرست تھے) آپ کی چھوٹی صاحبزادی کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے ہوئے ایک داماد تلاش فرمارہے تھے اور اس کے لئے حضرات والدین کے پاس پہلے ہی خط لکھ چکے تھے۔

آخر کار حضرت ہی کے ایما و مشورہ سے رشتہ طے ہوا اور اگلے ہی سال محرم میں نکاح بھی ہوگیا، حضرت کی توجہ اور شفقت دونوں جانب کچھ اس طرح کی تھی کہ باندہ سے مستقل سفر فرماکر الٰہ آباد تشریف لائے نکاح پڑھایا پھر وہاں سے بارہ بنکی تشریف لے گئے اور اگلے ہی دن گورکھپور کے قصبہ کھمپیر گنج تشریف لاکر ولیمہ میں بھی شرکت فرمائی۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اسی تمرین افتاء کے اخیر سال میں ایک مرتبہ نہایت محبت آمیز لہجہ میں ہتورہ آنے کو فرمایا کہ کبھی ہتورا بھی دیکھ جاؤ۔ عرض کیا حضرت! ہتورہ جا چکے ہیں، فلاں نکاح کے موقعہ پر حاضری ہوئی تھی، فرمایا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے آؤ تو کچھ دنوں کے لئے آؤ وہاں رہو عرض کیا جی حضرت انشاء اللہ حاضری ہوگی، مگر افسوس کہ نہ ہوسکی۔

فراغت کے بعد اگلے ہی سال یہاں تقرری ہوگئی تقرری کے بعد الٰہ آباد جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت قاری صاحب رات کے کسی حصہ میں تشریف لائیں گے اور صبح فجر سے قبل ہی واپسی ہوجائے گی۔ صبح بہت سویرے اٹھ کر افضل المعارف پہونچے معلوم ہوا کہ حضرت موجود ہیں فجر پڑھ کر جائیں گے، حضرت اندر کمرے میں تھے ملاقات نہ ہوسکی جب نماز کا وقت قریب آگیا تو احقر سنت میں مشغول ہوگیا

جیسے ہی وقت ہوا حضرت مسجد میں تشریف لائے احقر پر نظر پڑ گئی، سنت کی آخری رکعت تھی بس رک گئے اور اشارہ فرمایا کہ ان سے نماز پڑھواؤ احقر نے سلام پھیر کر فوراً مصافحہ کیا اور مصلے کی طرف بڑھ گیا قاری صاحب کے سفر کی عجلت کے خیال سے نماز بھی مختصر کر دی اور تسبیحات حذف کر کے مختصر سی دعا مانگ کر اٹھ کھڑا ہوا حضرت بہت زیادہ خوش ہو گئے اور فرمایا "فقیہ ہو گئے"

اللہ تعالیٰ حضرت کے اس جملہ کو قبول فرما کر حضرت مفتی صاحب کی جوتیوں کے طفیل فقہ سے حصہ عطا فرمائیں ؎

و یرحم اللّٰہ عبدا قال آمینا

برادر گرامی مولانا مفتی مجد القدوس خبیب صاحب رومی بھی ساتھ میں تھے احقر تکلف کی وجہ سے پیچھے تھا برادرِ محترم نے حضرت کو بتلایا کہ حمزہ کی گورینی ہی میں تقرری ہو گئی تو بجائے خوش ہونے کے شکایت آمیز غصہ میں فرمایا کیا صرف وہی ایک مدرسہ تھا ؟ اور کوئی مدرسہ نہیں تھا ؟ اور بھی کچھ فرمایا مطلب یہ تھا کہ حضرت شفقۃً یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ تقرری کی درخواست وہیں کیوں دے دی مجھ سے کیوں نہیں بتایا حضرت کی اسی طرح کی بہت سی شفقتوں کو سوچ کر احقر جیسے نہ جانے کتنے افرادیہ کہتے ہیں ؎

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

پھر ساتھ میں اسٹیشن تک جانے کا موقع ملا، وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ جس گاڑی سے جانا طے تھا وہ چھوٹ چکی ہے اور دوسری کے آنے میں کچھ وقت باقی ہے۔ اس وقت اسٹیشن پر برادرِ محترم مفتی خبیب صاحب کے ساتھ برادر گرامی مولانا نعمت اللہ صاحب جلیلی بھی تھے حضرت ہم تینوں سے گفتگو فرماتے رہے، اور یہ گفتگو زیادہ تر تعلیم و تعلم سے متعلق تھی، احقر سے پوچھا کہ تم کو کس فن سے خاص مناسبت ہے۔ عرض کیا کسی خاص فن کی تعیین مشکل ہے بس یہ ہوتا رہا ہے کہ جس وقت جو فن زیادہ مطالعہ میں آیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فن سے مناسبت ہو گئی ہے اس پر حضرت نے دریافت فرمایا کہ کچھ لکھتے بھی ہو ؟ عرض کیا جی ہاں حضرت مفتی صاحب کی زیر نگرانی حضرت مفتی صاحب کا ہی کچھ کام کرتے ہیں اور یہ بھی عرض کیا کہ آج کل "صید الخاطر" کے ترجمہ کا کام جاری ہے تو فرمایا کہ اس کا نام کیا رکھو گے ؟ عرض کیا کہ مفتی صاحب ہی تجویز فرمائیں گے ! تو ہنس کر فرمایا کہ "فیضِ خاطر" اس کا قافیہ ملے گا اور کیا ملے گا ؟ پھر حضرت نے موجودہ دور میں اساتذہ اور طلبہ کی پست ہمتی اور فنون سے عدم مناسبت کا تذکرہ شروع فرمایا۔ اس تذکرہ میں یہ بھی فرمایا کہ مظاہر میں میرا یہ معمول تھا کہ رات میں مطالعہ کرتا تھا ایک استاذ تھے جن کی میں خدمت کرتا تھا وہ بھی مطالعہ کرتے تھے، پھر ان کے مطالعہ کے بعد خدمت میں مشغول ہو جاتا جب وہ سو جاتے تو آکر پھر مطالعہ کرتا جب نیند آجاتی تو تھوڑی دیر کے لئے سو رہتا تھا پھر حضرت استاذ سے پہلے اٹھ کر ان کو جگاتا وضو کے لئے پانی رکھتا پھر خود بھی وضو کر کے تہجد پڑھ کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس طرح رات گذرا کرتی تھی جس میں سونے کی مدت بہت مختصر ہوتی تھی اس لئے اگر دو دو رات جاگ لیتا ہوں تو کوئی اثر نہیں ہوتا ہے

یہ بھی فرمایا کہ مظاہر میں میں نے کبھی ناشتہ کیا ہی نہیں، فجر کے بعد مطالعہ شروع ہوجاتا تھا پھر سبق میں شرکت ہوجاتی درمیان میں ناشتہ کا کوئی وقفہ نہیں ہوتا تھا اسی لئے آج تک مجھ کو ناشتہ کی عادت نہیں ہے۔

اور فرمایا کہ مجھ کو پوری طالبعلمی میں اسٹوو جلانا نہیں آیا، ایک مرتبہ ایک مہمان آگئے تو باہر سے دودھ لایا اور ایک ساتھی سے اسٹوو جلوا کر چائے بنائی۔

اپنے اسی طرح کے واقعات سنا کر موجودہ حالات پر شکوہ بھی فرماتے رہے کہ اب تو سب باتیں ختم ہوگئیں اب ہروقت ناشتہ اور کھانے ہی کی فکر رہتی ہے کپڑے کی اور دوستوں سے ملنے کی، اور تفریحات کی فکر میں رہتے ہیں استعداد کچھ بھی نہیں ہوتی ہے۔ اب آجکل اساتذہ نہیں مل رہے ہیں فنون کی کتابیں تو پڑھانے اور سمجھنے والے رہ ہی نہیں گئے۔ اسی لئے میں نے شرح جامی کا ایک "حل مطلب" لکھا ہے جس میں صرف نفس عبارت حل کی گئی ہے ورنہ حال یہ ہوگیا ہے کہ شارح کچھ فرمارہے اور استاد کچھ تقریر کررہے ہیں"۔ احقر عرض کرتا ہے کہ اس وقت تک حل مطلب طبع نہیں ہوا تھا، پھر دو سال بعد نہایت خوشنما سرورق کے ساتھ "التسهيل السامي في حل شرح الجامي" کے نام سے طبع ہوکر شائع ہوا، واقعی حل مطالب میں نفیس ہے اور بھی باتیں فرماتے رہے یہاں تک کہ گاڑی آگئی حضرت ایک نشست پر بیٹھ گئے، گاڑی کے چھوٹنے میں ۲۰، ۲۵ منٹ کا وقفہ تھا تو فرمایا کہ ارے بھائی ڈاک دیکھنی باقی رہ گئی تھی، ساتھ میں لیتا آیا ہوں اس وقت تم لوگ موجود ہو

جلدی جلدی دیکھ ڈالو، پھر حضرت نے پشتارہ نکالا تقریباً پچاس ساٹھ خطوط تھے، ہم لوگ جلدی جلدی ہر خط کو پڑھتے اور مضمونِ خط سے مطلع کرتے تھے اور حضرت مختصر لفظوں میں بعجلت تمام جواب لکھ دیتے، یعنی نوبت یہ تھی کہ حضرت لکھ کر فارغ ہوجاتے اور ہم لوگ ابھی خط کا خلاصہ سوچتے رہتے تھے۔ اچھے خاصے خطوط تھوڑے سے وقت میں نمٹ گئے۔

لیکن یہ بات افسوس کے ساتھ لکھی جارہی ہے کہ اکثر خطوط تعویذ اور دعاء سے متعلق تھے، اور دعا بھی دکان کے لئے مکان کے لئے، شادی بیاہ وغیرہ کے لئے تھی، دین کے لئے، عاقبت کے لئے اور دل کی اصلاح کے لئے شاید ہی دو خط اس مجموعہ میں رہے ہوں، یہ اس امت کا المیہ ہے اور ہم سب لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ کہ کیا اس ذات گرامی کی قدر اتنی ہی تھی ہمارے دلوں میں؟ کیا انہوں نے ساری زندگی شہر شہر قریہ قریہ پھر کر یہی دعوت دی تھی کہ لوگو! اپنی دنیا درست کرلو! وہ تو دین اور آخرت کی فکر تقسیم کرتے پھرتے تھے، عارضی دنیا کے بجائے دائمی عاقبت سنوارنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس اس کے لئے کوئی دل تیار نہیں ہوا۔

بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس
ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

ٹھیک ایک سال کے بعد شوال میں پھر حضرت کی زیارت ہوئی، دراصل حضرت والا گورکھپور تشریف لائے تھے، معلوم ہوا کہ شہر کی جامع مسجد میں حضرت کا وعظ ہوگا محترمی والد صاحب مدظلہم کے ساتھ احقر بھی کیمپیر گنج سے حاضر ہوا۔

حضرت نے وعظ فرمایا پھر کسی جگہ تشریف لے گئے قیام حضرت کا احقر کے نانہال ہی میں تھا، اور حضرت کی شفقت و توجہ محترم ماموں صاحبان پر بھی ایسی ہی تھی کہ وہ ہم سب کے لیے سرمایۂ سعادت اور باعثِ افتخار ہے۔

کسی اور موقعہ کی بات ہے کہ ایک مرتبہ خالو مکرم جناب محمد مطیع اللہ صاحب مدظلہم کی کار سے حضرت قاری صاحب نے ایک جگہ کا سفر فرمایا جہاں کسی عمارت کی بنیاد رکھنی تھی۔ حضرت تھے اور آپ کے ارد گرد ایک انبوہِ کثیر تھا۔ ماموں ذرا پیچھے رہ گئے تھے، اچانک حضرت نے گڑھے کے پاس سے آواز دی یعنی ماموں کو پکارا ماموں جلدی سے بڑھے کہ کوئی کام ہوگا قریب گئے تو حضرت نے فرمایا کہ چلئے پہلی اینٹ آپ رکھئے، اتنے بڑے مجمع میں اچانک ایسی صورت پیش آجانے سے ماموں کی عجیب کیفیت ہوگئی۔

غرض حضرت نے رات بھر گھر پہ قیام فرمایا پھر صبح "انجمن اسلامیہ اُنوَل" والے حضرات نے درخواست کی کہ اُنوَل تشریف لے چلیں، یہ شہر سے باہر ایک قصبہ ہے وقت کم تھا مگر حضرت نے گنجائش پیدا کرلی فجر پڑھ کر سب لوگ انول گئے احقر بھی ساتھ ہولیا تھا، وہاں فوراً سب کو جمع کیا گیا حضرت کے حکم سے احقر نے تلاوتِ قرآن پاک کی پھر حضرت کا بیان ہوا، یہ پہلا بیان تھا حضرت کا جو احقر نے اتنی یکسوئی کے ساتھ پورا سُنا تھا اور لفظ لفظ سے متاثر ہوا تھا، حضرت نے اس میں ایک عجیب بات فرمائی تھی، فرمایا کہ یہ انول والے حضرات اس سے پہلے بھی مجھ سے کہہ چکے تھے مگر اس وقت موقعہ نہیں مل سکا تھا اب پھر انہوں نے کہا تو باوجود اس کے کہ وقت میں گنجائش نہیں تھی ابھی بڑھ گنج جانا ہے پھر وہاں سے کوباگنج وغیرہ مگر میں نے اس وجہ سے منظور کرلیا کہ اگر آئندہ مجھ کو یہاں آنے کا موقعہ نہیں مل سکا تو کہیں قیامت میں مجھ سے پوچھ نہ ہوجائے کہ انول کے لوگوں نے دین کی بات سنانے کو کہا تھا تم نے کیوں نہیں سنائی وہاں کے لوگ فرمائش کر رہے تھے تو تم نے پہلو تہی کیوں کی؟ بس میں اسی خیال کی وجہ سے یہاں چلا آیا۔ اب تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ آخر تم لوگ بھی کچھ کروگے یا نہیں؟۔

پھر آگے سنت کی اہمیت پر اور اتباعِ شریعت پر مفصل بیان فرمایا، احقر نے مذکورہ گفتگو کو عجیب اس لئے کہا کہ احقر کے نزدیک غالباً یہی وہ محور تھا جس پر حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی کی چکی ساری عمر گھومتی رہی۔

وہاں سے فارغ ہوکر گیڈا (GEDA) یعنی گورکھپور شہر کے فیکٹری علاقہ میں تشریف لے گئے کیونکہ وہاں پر بلکہ ٹیچ کے مشہور سرجن ڈاکٹر ایوب صاحب کی کمپنی کی بنیاد رکھنی تھی سب لوگ وہاں بھی گئے حضرت نے بنیاد رکھی اور دعا فرمائی، سرینج بنانے والی یہ کمپنی ماشاء اللہ ہندستان میں نمبر ایک کا مال تیار کر رہی ہے اور شروعات نہایت امید افزا ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ وَبَارِکْ فِیْہِ۔

ایک مرتبہ مدرسہ میرٹھ میں بیت العلوم کے سالانہ جلسہ میں تقریر سنی اس وقت حضرت قاری صاحب کی طبیعت کچھ ناساز تھی مگر نہایت جوش اور جذبے سے بیان فرمایا دین کو مضبوطی سے تھامے رہنے اور معاملات کو شریعت کے

مطابق کرنے پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ مسلمان آج سود لے رہا ہے۔ کیا سود کی حرمت اسے نہیں معلوم؟ دوسروں کا حق دبا رہا ہے کیا اس کی حرمت اسکو معلوم نہیں ہے؟۔ سب معلوم ہے لیکن عمل پر آمادہ نہیں ہو رہا ہے غافل ہے دوسرے لوگ جاگ رہے ہیں آگے بڑھ رہے ہیں مگر مسلمان سو رہا ہے کیا ضروری ہے کہ بڑی بڑی کمپنیاں قائم کرو، معمولی تجارت سے پیٹ نہیں پل سکتا ہے رزق دینے والا تو خدا ہے حلال طریقہ سے کماؤ گے تو خدا دے گا کہ نہیں؟ آج بھی معاملات درست کرلو، شریعت کو مضبوطی سے تھام لو تو حالات بدل سکتے ہیں غیر آج بھی تمہاری قدر کرنے کو تیار ہیں مگر آج حال یہ ہو گیا ہے کہ کہتے ہیں سب پر اعتبار کرلو مگر مسلمان پر اعتماد نہ کرنا کیا مسلمانوں کا معیار اس قدر پست ہو گیا ہے؟ مسلمان اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بھول بیٹھا ہے اگر آج بھی درست ہو جائے تو دوسرے لوگ متاثر ہوں گے اسلام کے قریب آویں گے۔ ابھی دو چار دن کا واقعہ ہے کہ ایک پنڈت کا گھرانہ اسلام لایا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ باحیثیت آدمی تھا سفر کر رہا تھا گاڑی میں ریزرویشن نہیں مل سکا بہت پریشان تھا (غالباً ساتھ میں لڑکی بھی تھی) ایک ٹی ٹی نے پریشان دیکھ کر اپنے مخصوص اختیار سے جگہ دیدی اور ریزرویشن دیدیا وہ شخص چونکہ اس احسان سے بہت متاثر تھا کچھ روپیہ نکال کر دینے لگا ٹی ٹی نے انکار کیا کہ میں نہیں لوں گا اسکو بہت تعجب ہوا پھر بھی اس نے دینا چاہا تو ٹی ٹی نے کہا کہ میں رشوت نہیں لیتا ہوں اس نے کہا میں خوشی سے دے رہا ہوں ٹی ٹی نے کہا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میرا مذہب اسکی اجازت نہیں دیتا ہے۔ میرے مذہب میں حرام ہے، یہ سن کر پنڈت نے پوچھا کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے کہا مسلمان ہوں۔ پنڈت نے کہا آخر اور بھی لوگ تو مسلمان ہیں وہ کیوں لیتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اور لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہے ہیں، میرا فلاں بزرگ سے تعلق ہے اس لئے میں مذہب پر عمل کی کوشش کر رہا ہوں یہ سن کر پنڈت نے کہا کہ میں اسلام مذہب کو بہت پسند کرتا ہوں اور اسکی تعلیمات کو دل سے مانتا ہوں، مگر ایک رکاوٹ تھی وہ یہ کہ اسلام کے ماننے والوں کو میں اچھا اور اس پر عمل کرنے والا نہیں پاتا تھا، مگر آج میری یہ رکاوٹ دور ہو گئی مجھ کو معلوم ہو گیا کہ عمل کرنے والے بھی موجود ہیں پھر اس نے پورے کنبہ کے ساتھ اسلام قبول کرلیا یہ یں کوئی افسانہ نہیں سنا رہا ہوں ابھی چند دنوں پہلے کا واقعہ ہے اور اگر آج مسلمان عمل پر آمادہ ہو جائیں تو پورے ملک کے حالات بدل سکتے ہیں"۔

پھر یہ فرماتے ہوئے تو حضرت کی آواز بھر آگئی کہ کیا مسلمان حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی آپکے طریقہ کو چھوڑ کر دوسروں کے طریقہ پر چلے گا اور اس پر فخر کرے گا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اسکو حضور کا طریقہ نہ پسند ہو اور غیروں کے طریقہ میں خوشی محسوس کرے"۔

اسی طرح کا نہایت پرجوش اور ایمانی بیان ہوا اور غالباً اسکے بعد احقر کو حضرت کا کوئی بیان سننے کا موقعہ نہیں

مل سکا، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

آخری ملاقات اس معنیٰ میں کہ جب یہ لفظ بولا
جاتا ہے تو عرفاً یہی مطلب ہوتا ہے کہ اس سرائے فانی
کی چند روزہ زندگی کی آخری ملاقات تھی ورنہ ایک
مومن کی دوسرے مومن سے آخری ملاقات کا، اگر دونوں
ایمان سلامت لے کر جائیں۔ کوئی معنیٰ ہی نہیں حضرت
قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اسی سال یعنی شوال
میں الٰہ آباد اسٹیشن پر ہوئی، حضرت ٹرین سے کہیں
تشریف لے جا رہے تھے الٰہ آباد سے گذرنا تھا اس
وقت خالوئے محترم الٰہ آباد میں نہیں تھے اس لئے حضرت
نے آپ کے صاحبزادہ مولانا افضال احمد صاحب قاسمیؔ کو
فون سے مطلع فرمایا، برادرِ محترم نے از راہِ کرم احقر کو بھی
ساتھ لے لیا گاڑی آئی حضرت ایر کنڈیشنڈ ڈبہ میں تھے ہم دونوں
نے زیارت کا شرف حاصل کیا پہلے تو حضرت برادرِ محترم سے
مخاطب رہے پھر احقر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم کو لکھنا
آتا ہے ایک سال کے لئے ہمارے پاس چلے آؤ تم سے لکھنا سیکھیں
گے۔"

بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر حضرت کا مقصد کیا ہے اس
لئے حیرت کا مجسمہ بنا حضرت کو دیکھتا رہا حضرت نے پھر فرمایا
کہ ایک سال کے لئے نہ سہی چھ ماہ کے لئے آجاؤ کچھ ہماری
اصلاح ہوگی کچھ تمہاری"۔ احقر عجب کشمکش میں پڑ گیا تھا
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا فرمانا چاہتے ہیں اس
لئے بُت بنا رہا حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ بولتے کیوں نہیں آؤ گے
اچھا چلو تین ماہ کے لئے آجاؤ" احقر پر سکتہ سا طاری ہو چکا تھا
اس لئے خاموش ہی رہا پھر حضرت نے ناظم صاحب کے نام پیغام
کہلایا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

یہ مختصر سی ملاقات تھی اور یہ گفتگو مقصد اس
وقت بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا بہت غور کیا تو ذہن اس
نتیجہ پر پہونچا کہ "لڑکی کے نکاح میں دعوت" کے موضوع
پر حضرت مولانا عبید اللہ صاحب اسعدی زید مجدہم نے جو مضمون
لکھا تھا احقر نے اس پر تعاقب کیا تھا جب وہ تعاقب
شائع ہوا تو دلائل کی قوت کی بنا پر حضرات اکابر نے
اسکو بہت پسند فرمایا لیکن علمی بحثوں میں جس درجہ کی
سنجیدگی اور مخاطب کی رعایت اور احترام ملحوظ رہنا
چاہئے تھا اس میں احقر سے کمی ہو گئی تھی جس پر اساتذہ نے
اور بعض شفیق اکابر نے پہلے ہی متوجہ فرما دیا تھا اور احقر نے
اس کمی کو محسوس کر کے مولانا عبید اللہ صاحب سے ملاقات
ہونے پر معافی بھی مانگ لی تھی اور امید ہے کہ مولانے وسعتِ
ظرفی کی بنا پر دل سے معاف بھی فرما دیا ہوگا۔ غالباً حضرت
قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کمی کی طرف لطیف انداز
میں متوجہ فرمانا چاہ رہے تھے۔

کاش اسی وقت یہ خیال ذہن میں آگیا ہوتا تو جواب
عرض کر کے حضرت کی دعائیں حاصل کر لیتا مگر افسوس اب
اس کا موقعہ نہیں رہ گیا ہے۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اب اس دنیا
میں نہیں رہ گئے اور دنیا میں جو بھی آیا ہے ایک دن
نہیں رہ جائے گا۔ خود یہ دنیا بھی نہیں رہے گی۔

کتنے آئے اور چلے گئے۔ کتنے آرہے ہیں اور جارہے ہیں، اور ابھی کتنے ہیں جو آنے والے ہیں اور آخر ان کو بھی جانا ہے۔ مگر نہ ہر ایک کا آنا آنا ہوتا ہے اور نہ ہر شخص کا جانا جانا۔

برسات کے کیچوے بھی پیدا ہوتے ہیں مگر کیا کسی نے ان کو جانا پہچانا اور یاد رکھا اور وہ دیکھیے حضرت آمنہ کی گود میں ایک بچہ آیا ہے مشرق سے مغرب تک نور پھیل گیا ہے ہزار سالہ آگ ٹھنڈی ہوگئی ہے کسریٰ کے قلعہ کے کنگرے گر رہے ہیں، زمین سے لے کر آسمان تک اور آسمان سے عرش تک خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ صلے اللہ علیہ وسلم

یہی موت کا حال ہے کہ نجانے کتنے افراد روزانہ موت کی آغوش میں جارہے ہیں مگر کسی فرد بشر کی پیشانی کو شکن کی زحمت بھی گوارا نہیں ہوتی اور دوسری طرف کسی ایک فرد کی موت سارے عالم کی موت اور پوری کائنات کے غم کا سبب بن جاتی ہے۔

ہمارے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ کی ذات گرامی بھی ایسی ہی شخصیات میں سے تھی جن کی جدائیگی کا صدمہ نہ صرف ایک گھرانہ ایک گاؤں ایک بستی ایک ملک بلکہ ساری دنیا کو پہونچتا ہے۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ساری کائنات متاثر ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

حضرت کی ذات میں مقبولیت اور محبوبیت کے تمام اوصاف جمع ہوگئے تھے۔ آپ ایک طرف علم کی جملہ اصناف سے نہ صرف یہ کہ مناسبت رکھتے تھے بلکہ سب میں کمال اور مہارت رکھتے تھے۔ اور دوسری طرف علم کا نور تقویٰ، طہارت، حسن خلق، امت پر شفقت، خلق خدا کی خیر خواہی، مجاہدہ و ریاضت گویا مروت اور ولایت کے تمام اوصاف خاصہ حسنہ سے مزین اور آراستہ تھے۔ آپ کے اوصافِ حسنہ سے خلق خدا کو خوشبو ملتی تھی جس سے مشامِ جاں معطر ہوا کرتے تھے، آپ کی ذات سے امت کو روشنی حاصل ہوتی تھی ایسی روشنی جس سے قلوب منور ہوتے تھے۔ گویا آپ ایک روشن چراغ اور بستانِ محمدی کے خوبصورت مہکتا ہوا پھول تھے۔ افسوس آپ کے جانے سے چمن سونا معلوم ہو رہا ہے اور دنیا میں اندھیرا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر دو چار چراغ ابھی موجود نہ ہوتے تو اس حادثہ پر صبر دشوار ہوجاتا اور واقعۃً یہ امت سخت اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی، مگر اللہ کا کرم ہے اور اس کی کمال تربیت کا کرشمہ کہ ابھی امت کو سہارا دینے والے اور روشنی دکھانے والے کچھ حضرات موجود اور سلامت ہیں اللہ تعالیٰ تادیر سلامت رکھیں۔ یہ الگ بات ہے کسی میں روشنی سبز ہے اور کسی میں زرد اور کسی میں بالکل سفید دودھیا مگر ہے ہر ایک نور بکھیرنیوالا اور اجالا پھیلانیوالا۔ اللہ تعالیٰ قدردانی کی توفیق عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ سے یہ سبق دیا ہے کہ قلبِ غافل چونکے اور دیدۂ خفتہ بیدار ہوجائے ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اللھم برد مضجعہ ونور مرقدہ ووسع مدخلہ واکرم منزلہ وارفع درجتہ وادخلہ الجنۃ جنۃ الخلد، اللھم اغفرلنا ولھم وارحمنا وارحمھم، اللھم صل علی محمد ن النبی الامی وعلی اصحابہ وآلہ واتباعہ اجمعین۔

از: محمد معاویہ سعدی، گورکھپوری، کمپیوٹر گرافک خادم
متعلم دارالعلوم ریاض العلوم چوکیہ، گورینی، جونپور

"زمینِ ہند کا ذرّہ چراغِ آسماں نکلا"

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اور :-

ع عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۵ء بوقت دوپہر اچانک ایک خبر ملی جو دل پر بجلی بن کر گری، دل دھک سے ہو کر رہ گیا، کانوں کو یقین نہ آیا اس خبر نے ہر ایک کو سکتے میں ڈال دیا، لوگوں کے ہوش اڑ گئے، کوئی اس بات پر یقین کر لینے کو تیار نہ تھا کہ سسکتی دم توڑتی انسانیت کا مسیحا، بھٹکتی لڑکھڑاتی امت کا سہارا، تڑپتے بلبلاتے بیماروں کا مداوائے غم، سسکتے سر پٹختے زخمی دلوں کا مرہم، ایسا آفتاب و ماہتاب جس سے نہ جانے کتنے تاریکیوں میں بھٹکتے لوگوں کو روشنی ملتی تھی، ایسا عظیم مصلح جس سے نہ معلوم کیسے کیسوں کو راہِ ہدایت نصیب ہوتی تھی، ایسا غمخوارِ انسانیت جس سے نہ جانے کون کون کس کس طرح کے تعویذ لکھواتا، پانی پھنکواتا، دعائیں کرواتا اتنے چپکے اور آہستہ سے ہمیں یوں ہی مصیبتوں کے سمندر میں غوطے لگاتا، آفتوں کے دریاؤں میں ڈبکیاں کھاتا، چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا، انا للہ وانا الیہ راجعون

ے اسی ماحول میں گم ہو گیا ہنستا ہوا تارا
سوادِ اعظم اسلام کا رخشندہ مہ پارا

اور :-

ے نہ جانے کیا اچانک موج آئی اسکی رحمت کو
اٹھا کر لے گئی آغوش میں جبریں طلعت کو

۲۳ ربیع الثانی عین نماز عصر کے وقت دورانِ وضو حضرت عارف باللہ قاری صدیق احمد صاحبؒ کے اوپر اچانک فالج کا دورہ پڑا جس سے بدن میں سخت کپکپی اور تیز جھٹکے کی کیفیت پیدا ہو گئی، فوراً ہی مقامی اطباء سے رجوع کیا گیا لیکن مرض کی صورتحال انکے قابو سے باہر تھی، اسی درمیان حضرت نے صورتحال کی نزاکت کو محسوس فرماتے ہوئے مخصوصین کو جمع فرمایا اور پھر کچھ نصیحت و وصیت فرمائی پھر ڈاکٹروں کے مشورہ سے حضرت کے باصرار منع کرنے کے باوجود آپ کو لکھنؤ بھیجا گیا، جبکہ حضرت زبانِ حال سے بار بار یہ اشعار پڑھ رہے تھے ے

دلِ مضطر نے مرنے کی تمنا عمر بھر کی ہے
نہ پوچھو داستانِ زیست کیونکر مختصر کی ہے
عزیزو! جستجو بے فائدہ اب چارہ گری ہے
یہ ہے دردِ محبت چوٹ یہ قلب و جگر کی ہے

پھر وہاں کے مشہور اسپتال "سحر نرسنگ ہوم"
میں داخل کرایا گیا، جہاں ہمیشہ کیطرح ایک بار پھر تدبیر
کے ڈاکٹروں اور تقدیر کے فرشتوں کے درمیان معرکہ
سرگرم ہوا — اس درمیان حضرت مولانا علی میاں
صاحب ندوی مدظلہٗ بھی عیادت کیلئے تشریف لے آئے
اور دیگر اہالیان شہر کی آمد کا بھی سلسلہ جاری تھا کہ
اچانک ہی موت کے فرشتے بھی عیادت کیلئے حاضر
ہوئے۔

لیکن آہ ان سے حضرت کی یہ دنیوی تکلیف نہ
دیکھی گئی اور حضرت کو اس قدر مشقت میں دیکھ کر ان
رحم دلوں سے نہ رہا گیا وہ ہمارے حضرت کی روح کو لیکر
ایسی جگہ چلے گئے جہاں کوئی تکلیف ہے نہ مشقت، کوئی
الجھن ہے نہ کلفت — راحت ہی راحت، آرام ہی آرام
اور قرآن پاک کی زبان میں الا ان اولیاء اللّٰہ
لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔ تقدیر کے
فرشتوں نے تدبیر کے ڈاکٹروں کو اسوقت شکست سے
دوچار کر دیا جبکہ تقریباً دس بجے حضرت عالم ربانی،
مردِ حقانی عارف باللہ مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب
نور اللہ مرقدہٗ (بعمر ۷۰ سال) اس دنیائے فانی سے
دار باقی کیطرف رحلت فرما گئے۔ اناللہ۔ اس موقعہ
پر حضرت کے چہرے پر چھایا ہوا ابدی سکون یہ کہہ رہا
تھا ؎

اب کیا ستائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں
ہم اب حدودِ سود و زیاں سے نکل گئے

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ "ہر ایک پر فنا طاری
ہے" اور شاعر کی زبان میں ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

جو بھی اس دنیا میں آتا ہے یہاں رہنے اور قد
جمانے کیلئے نہیں، آج آیا ہے کل چلا جائے گا، لیکن ا
حقیقت کا تصور جب ہم ایسی ذات کے بارے میں کر
چاہتے ہیں جنکی زندگی کے کارنامے انمٹ اور لازوا
ہوں اور جنکے اخلاق و کردار کی بلندی سے ہمارے قلو
متأثر ہوں تو ہمارے تصورات و تخیلات کی بلندی ا
انتہا تک پہونچنے سے انکار کر دیتی ہے اور دل اس با
پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا کہ ایسی عظیم شخصیت
بھی موت کا آہنی پنجہ گڑ سکتا ہے اور ایسی بلند ہستی
بارے میں بھی تقدیر کا یہ اٹل فیصلہ صادر ہو سکتا ہے
ہمارے حضرت قاری صاحبؒ بھی ایسی ہی عظیم المرتب
ہستیوں میں سے تھے، کہ ان کے سانحۂ ارتحال کی
لوگوں کے قلوب پر صاعقۂ آسمانی بن کر گری، لوگوں
یقین نہیں آیا کہ حضرت قاری صاحبؒ بھی اس شعر
بزبان حال پڑھ سکتے ہیں ؎

بجلی تڑپ کے قصۂ غم ہی چکا گئی!
اچھا ہوا میں خار و خس آشیاں میں تھا!

لیکن بہر حال یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس ک
حقانیت کا تجربہ لوگوں کو اس سے پہلے بھی بارہا ہو چک
تھا اور ہر مرتبہ لوگوں نے اسکو جھٹلانے کی ناکام کوش

بھی کی تھی ـــ یہ جانتے کے باوجود کہ یہ ایک ایسا فیصلہ اور ایسا وقوعہ ہے جس سے نبی مستثنیٰ ہوئے نہ ولی ۔ امیر کو چھوڑا گیا نہ غریب کو بس کیفیت کے فرق سے ہر ایک کو اس مرحلے سے گذرنا پڑا۔

آخر لوگوں کو یقین آگیا، حقیقت معلوم ہوگئی پھر اسکا جو اثر ہونا تھا وہ بھی ہوا کہ ملک کے اطراف و جوانب سے مسیحائے دوراں کی وفات حسرت آیات کی اطلاع پاتے ہی یتیموں اور مسکینوں، ضعیفوں اور دردمندوں، بوڑھوں اور جوانوں، حضرت کے مریدوں اور عقیدتمندوں کا قافلہ کا قافلہ ہتھورا کی جانب رواں دواں ہوگیا ـــ حضرت کی وفات کی خبر ہندوستان کے طول و عرض میں جنگل کی آگ کیطرح پھیل گئی، جس نے جس حال میں یہ خبر سنی (بشرطیکہ موقع ہوا) ہتھورا آتا گیا چلا آیا، نماز جنازہ تقریباً رات نو بجے پڑھی گئی، سنا ہے کہ اس درمیان سرزمین ہتھورا پر بیک وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس اپنے قدم رکھ چکے تھے، جس میں علما بھی تھے صلحا بھی، افسران بھی تھے عہدہ داران بھی، امیر بھی تھے غریب بھی، مسلم بھی تھے ہندو بھی، اپنے بھی تھے پرائے بھی، شاید ایسا ہی کوئی منظر تھا جبکہ شاعر کی زبان سے بے اختیار یہ اشعار جاری ہوگئے تھے ـــ

ملائک نے بھی آسماں سے اتر کر
یہ کس کی نماز جنازہ ادا کی
یہ اس دھوم سے کس کا نکلا جنازہ
یہ کیوں ٹوٹ پڑی ہے خلقت خدا کی
فرشتے بچھاتے ہیں پر، حور آنکھیں
یہ میت اٹھی کس شہید وفا کی

یہاں نہ "باندہ چلو" مہم تھی، نہ اجتماعات کیطرح پہلے سے کسی تاریخ کا اعلان اسکے باوجود دیکھنے والوں نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق آئے چلے جارہے تھے، آمد کا ایک سلسلہ لگا ہوا تھا جو ٹوٹنے کا نام نہ لیتا تھا، لوگ بدحواس تھے کہ اچانک یہ مصیبت کہاں سے ٹوٹ پڑی ہے اور یہ حادثہ کیونکر وجود میں آگیا؟ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ ان سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، ہر شخص خود اپنی جگہ حیران و پریشان تھا۔ ایسی عظیم شخصیتیں جب اس دنیا سے پردہ فرماتی ہیں تو ہر ایک دوسرے سے زیادہ خود اپنی ہی تعزیت کا حقدار و مستحق ہوتا ہے، ایسے اکابر امت اور محسن انسانیت کی رحلت اور انکے سفر آخرت کے موقع پر صرف اہل خانہ اور اہل خاندان ہی نہیں بلکہ ساری مخلوق اور سارے لوگ سوگوار ہوتے ہیں، تبھی تو فرمایا گیا ہے، موت العالِم موت العالَم، ایسے میں بتائیے کہ اپنے رنجور و مغموم دل کو تسلی دینے کیلئے اسکے علاوہ اور کونسا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ شاعر کا یہ شعر ؎

فقط ایک میں ہی نہیں رو رہا ہوں
یہاں محو آہ و فغاں اور بھی ہیں

گنگنا لیا جائے اور صبر کر کے بیٹھ رہا جائے ۔

انسانی زندگی کا کمال یہ ہے کہ وہ خالق تعالیٰ

کی فرمانبرداری، واطاعت گذاری میں اپنا تن من دھن صرف کردے اور اسے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل نصیب ہو جائے ــــ اور یہ بات پیدا ہوتی ہے حقیقی عشقِ نبوی اور سچی حب رسولؐ سے ــ ہمارے حضرت قاری صاحبؒ کی سیرتِ مبارکہ پر نگاہ کیجئے آپکو یقین ہو جائے گا کہ حضرت صحیح معنوں میں عشقِ نبویؐ سے سرشار اور حبِ رسول سے سرفراز تھے، جسکا اظہار آپکے ہر ہر قول، ہر ہر فعل، ہر ہر ادا سے ہوتا تھا، آپکو اللہ رب العزت نے شعر و شاعری کا ذوق بھی عطا فرمایا تھا۔

عشقِ نبویؐ کی حرارت اور طبیعت کے شاعرانہ امتزاج سے جو حسین سا شعر ظہور میں آیا وہ ملاحظہ ہو ے

بوقتِ مرگ لب پر ہو درودِ مصطفےٰؐ جاری
مکمل اسطرح ہو حبِ ختم المرسلیں میری (ثاقبؒ)

حبِ رسول کے ساتھ ساتھ شانِ استغنا کے اجتماع نے زبانِ مبارک سے جو شعر صادر کروایا وہ بھی ملاحظہ ہو ے

گدائی انکے در کی جب سے مجھکو ہو گئی حاصل
غلامی آکے کرتے ہیں شہِ مسند نشیں میری

اور شجرۂ حبِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم سے نکلنے والا ثمرہ اتباعِ نبویؐ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ، سنت کے حد درجہ پابند، اتباعِ رسولؐ کے بے انتہا حریص اور اخلاقِ نبویؐ کے انتہائی جامع تھے۔

غالباً آپ ہی جیسے کسی محبِ رسول اور عاشقِ سنت کے بارے میں شاعر نے یہ شعر کہا تھا اور بالکل سچ کہا تھا ے

کتابِ زندگی کا ہر ورق تصویرِ سنت ہے
تیری ہر نقل و حرکت نقشۂ تدبیرِ سنت ہے

مکارمِ اخلاق کی فہرست اٹھا کر دیکھئے تو اسمیں تواضع و سادگی، ضیافت و مہمان نوازی، ایثار و خدمتِ خلق، عاجزی و انکساری، شفقت و ایفاءِ عہد کے موضوعات خاص اہمیت و شان کے حامل معلوم ہونگے۔

قاری صاحبؒ کی ذات والاصفات میں اللہ رب العزت نے ان تمام صفات حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کو جمع فرما دیا تھا۔

تواضع و سادگی میں تو آپ اکابر و اسلاف کی یادگار اور صحابہ کرام کا نمونہ تھے، اور ہمارے زمانے میں اس صفتِ خاص میں آپ بے مثال تھے، آپ تواضع کے کس مقام پر پہنچے ہوئے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ ایک مرتبہ مدرسہ تھورا کے "بھنگیوں" نے طلباء سے ہوئی کسی جھگڑ کی بنا پر "اسٹرائک" کردی۔ حضرت قاری صاحبؒ موجود نہ تھے، کہیں سفر میں تشریف لے گئے تھے واپسی پر حالات کا علم ہوا، اور ادھر "سنڈاس نما" استنجا خانوں کی تعفن اور بدبو فضا کو خراب کیے ہوئے تھے، قربان جایئے ایسی سراپا تواضع ذات پر جو رات کی تاریکی میں اٹھ کر جھاڑو بالٹی لیے ہوئے خود ہی صفائی کا کام

انجام دینے پہنچ گئی، واہ رے پیکرِ تواضع اور مجسم انکسار۔

حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا اعلیٰ نمونہ پیش کر دیا جبکہ آپ نے اپنے ایک یہودی مہمان کی پھیلائی ہوئی غلاظت کو اپنے مبارک ہاتھوں سے صاف فرمایا تھا، اور شاید شاعر نے کسی ایسے ہی پیکرِ تواضع اور مجسم انکسار کو دیکھکر یہ کہا تھا کہ ؎

شرف تجھکو ملا بزمِ ولاء کی باریابی کا
صحابی گو نہیں لیکن نمونہ ہے صحابی کا

تواضع ہی کیطرح اسلامی تعلیمات میں ضیافت کو بھی ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔

معلوم نہیں کیسے لوگ ضیافت و مہمان نوازی میں حاتم طائی کا نام لیتے ہیں حالانکہ اگر ہمارے اسلاف کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صفت ایک سچے پکے مسلمان سے زیادہ کسی میں نہیں پائی جا سکتی، خود ہمارے حضرت قاری صاحبؒ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کیجئے، معلوم ہو جائے گا کہ آپ کس درجہ کے مہمان نواز تھے

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رات کا کچھ حصہ گذر چکا تھا حضرت چند خدام کے ساتھ مدرسہ ہی میں تشریف رکھتے تھے کہ اچانک ہی کسی بڑی گاڑی کی گڑگڑاہٹ اور انجن کی آواز سے فضا میں شور بلند ہوا اور ساتھ ہی ایک ہیڈ لیمپس کی روشنی اندھیرے کو پھاڑتے ہوئے حدودِ مدرسہ میں داخل ہوئی، فوراً ہی خادم کو دوڑایا گیا، معلوم ہوا کہ تقریباً بیس تیس نفر ٹرک پر سوار کانپور سے آئے ہیں

حضرت کی خدمت میں شرف حضوری حاصل کرنے والے ابھی عرصہ جانتے ہونگے کہ ہر آنے والے سے حضرت کی طرف سے کیا جانے والا پہلا سوال کھانے کے بارے میں ہوتا تھا وہی یہاں بھی ہوا کہ "آپ لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں یا نہیں؟" اللہ کے ان بندوں نے نہ وقت کا خیال کیا نہ آئندہ پیش آنے والی دقت کی پرواہ، جواب عنایت فرمایا کہ "نہیں ابھی کھانا نہیں کھایا ہے"۔ ادھر حال یہ تھا کہ نہ مدرسہ میں کھانا بچا تھا نہ مہمان خانہ میں، اب آپ تصور فرمایئے کہ رات کا وقت ہے، دیہی علاقہ ہے، افراد اتنے ہیں کیسی کچھ پریشانی ہوئی ہوگی؟ لیکن ایک بار پھر اور پر گذرا ہوا مصرعہ دہرایئے کہ ع

صحابی گو نہیں لیکن نمونہ تھا صحابی کا

پھر یہ واقعہ ملاحظہ فرمایئے کہ آپ نے رات کے ایسے وقت مہمانوں کو تو خدام کے حوالے کیا کہ مہمانخانہ میں قیام و آرام کا انتظام کریں اور خود شب کی اسی تاریکی میں اساتذۂ مدرسہ کے محلہ مولوی گنج، تشریف لے گئے اور ہر ہر گھر سے بچا ہوا کھانا لیکر آئے، جو کچھ بھی ملا مہمانوں کے سامنے پیش کر دیا، واقعی بات ہے کہ:۔

ع لکھے گا وقت آبِ زر سے تیرے کارناموں کو

جس طرح آپ تواضع و سادگی، ضیافت و مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ ہی تھے اسیطرح صفت ایثار میں بھی ہمارے زمانے میں آپکی کوئی مثال ملتی ہے نہ نظیر، آپکی پوری زندگی ہی دوسروں کو آرام پہنچانے میں گذر گئی۔ آپ نے دوسروں کے آرام کی خاطر نہ اپنی جان کو

جان سمجھا نہ آرام کو آرام، نہ سکون کو سکون سمجھا نہ نیند کو
نیند ـــ سفر، حضر، صحت، بیماری ہر ہر موقع پر آپ ہمیشہ
دوسروں ہی کے کام اور آرام کی فکر میں لگے رہے حتیٰ کہ
مسلسل کئی کئی روز کی بے خوابی اور حد درجہ تکان ہی
آپکے ضعف وکمزوری کا سبب بن گئی۔

حضرت قاری صاحبؒ کی پوری زندگی ہی انبیاء
علیہم السلام کے مشن کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے
میں گذر گئی پھر قاری صاحبؒ کے اندر یہ نبوی اوصاف
کیوں نہ پائے جاتے۔

حضرت قاری صاحب کی حیات طیبہ کے اوراق
الٹئے، آپکے اخلاق وعادات، معاملات ومعاشرت پر
نگاہ دوڑائیے تو آپکو حضرت کی زندگی کے ہر ہر واقعہ
ہر ہر معاملہ میں "شفقت علی الخلق" کا جذبہ کارفرما نظر
آئیگا۔ حضرت کا باوجود تکان وضعف کے، بیماری و
مرض کے لوگوں سے دور دراز کے سفر کا فوراً وعدہ کرلینا،
فوراً ہی انکی درخواست کو قبول کرلینا، کسی بھی امیر غریب،
عالم، عامی میں کوئی فرق نہ فرمانا جس نے بھی عرض کردیا
کہ حضرت فلاں جگہ فلاں پروگرام ہے اسمیں شرکت کرنی
ہے انکی درخواست کو شرف قبول بخشدیا جانا یہ سب کا
سب اسی صفت خاص کا پرتو ہے، انکی مثال حضرت
کی پوری زندگی ہے، جس کا ہر ہر واقعہ اسی صفت کی بنیاد
پر تعمیر ہوا ہے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا
مطالعہ فرمایئے تو آپ کو حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی
حیات طیبہ کا ایک نمایاں پہلو ایفاء عہد نظر آئے گا ـــ
ہمارے حضرت قاری صاحبؒ چونکہ صحیح معنوں میں وار
رسولؐ تھے اور آپکے سچے جانشین تھے اس لئے آپ ک
اندر بھی اس صفت حسنہ کا پایا جانا ناگزیر تھا۔

چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہمارے برادر محتر
جناب مولوی عبد التواب صاحب مدظلہ، نے کسی موقع
حضرتؒ سے درخواست کی کہ "حضرت میں نے دوکا
کھولی ہے، تشریف لے چلیں، برکت کی دعا فرمادیں
قاری صاحبؒ نے اس وقت تو معذرت فرمادی لیکن
آئندہ کیلئے وعدہ فرمالیا ـــ پھر کچھ ہی عرصہ بعد حضرت ک
گورکھپور کا سفر ہوا، وہاں کے پروگرام سے فارغ ہونے
بعد گاڑی میں تاخیر کی بناء پر دو تین گھنٹے کا وقت ن
رہا تھا، خدام سے سوال فرمایا کہ بھائی کیمپیر گنج کتنی د
ہے، اتنے وقت میں وہاں کا سفر ہوسکتا ہے یا نہیں
ظاہر ہے کہ جواب اثبات میں رہا ہوگا، فرمایا! تو پھر چلو
برادر محترم فرماتے ہیں کہ میں (غالباً) دوپہر کے وقت
دوکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک حضرت تشریف لا
اور فرمایا کہ بھائی! بہت جلدی میں ہوں، تم سے کیا
ہوا وعدہ یاد تھا سوچا کہ معلوم نہیں بعد میں وقت ملے
یا نہ ملے اس لئے اسی وقت وعدہ پورا کردینا چاہئے
اللہ اکبر۔ وقت کا شیخ المشائخ ایک عام آدم
کے معمولی سے کام کیخاطر باوجود تکان کے پینتیس ک
میٹر کی مسافت طے کررہا ہے جبکہ وقت بھی اتنا کم ہے
اور فرصت بھی اتنی تھوڑی۔

"جفاکشی" بھی ایک ایسی صفت ہے جس سے
حضرت قاری صاحبؒ کو کافی وافر مقدار میں حصہ ملا
تھا، چنانچہ آپ نے تبلیغی و اصلاحی سلسلے کے جو
مسلسل اور بے تکان اسفار فرمائے ہیں وہ اسی صفتِ
نبویؐ کا ثمرہ ہے ــــ آپ کا ہر ہر واقعہ اسکی مثال
ہے لیکن اسمیں سے ہم صرف ایک واقعہ یہاں نقل
کرتے ہیں...... کچھ دنوں کی بات ہے کہ چند
خدام کیساتھ کسی طویل سفر سے آپکی واپسی ہوئی آپکے
ساتھ میرے ماموں جان بھی تھے وہ بیان فرماتے ہیں
کہ ہم لوگ مدرسہ پہنچے، حضرت نے وہاں منتظمین سے
فرمایا کہ دیکھو بھائی! مہمانانِ کرام بہت تھکے ہوئے
ہیں انہیں مہمان خانے لے جاؤ وہاں قیام وطعام
کا انتظام کرو پھر فوراً ہی سلا بھی دو، ماموں نے فرمایا
کہ اِدھر ہم تیس چالیس سالہ "بوڑھوں" کے تو تکان
و آرام کے خیال کا حکم صادر فرمایا جارہا تھا اور اُدھر
ستر سالہ بڑے میاں کیلئے اعلان ہورہا تھا کہ فلاں
جماعت کے طلباء حاضر ہوجائیں، حضرت والا سبق
پڑھائیں گے۔ اللہ رے! محنت وجفاکشی۔

کہاں تک الفاظ وعنوان بدل بدل کر قاری
صاحبؒ کے حالات وواقعات سنائے جائیں،
الفاظ کے ذخیرے ختم ہوجائیں گے، عنوانات کی تھیلی
خالی ہوجائے گی ــ اس کے بعد بھی قاری صاحبؒ
کی زندگی پر اگر ہم ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالیں گے
تو ہمیں احساس ہوگا کہ ہم نے ابھی آپکی سوانح حیات
کا دسواں حصہ بھی نہیں بیان کیا ــ خصوصاً اگر آپ کے
اخلاق واوصاف پر قلم اٹھایا جائے اور دفتر کے دفتر بھی
سیاہ کر دیے جائیں تو بھی حق یہی ہے کہ حق نہ ادا ہوسکے گا
ہاں ہم بس اپنی تسلی کی خاطر جو کچھ بھی تھوڑا بہت لکھ
لیں ــ لکھ لیں ورنہ تو۔ ع

تری کل زندگی مجموعۂ کردارِ روحانی

ویسے ایک شاعر نے قاری صاحبؒ ہی جیسی متواضع
سادہ مزاج، اور وفاکیش ذات کی مدح سرائی کرتے
ہوئے ایک شعر کہا تھا اور خوب کہا تھا کہ ؎

تواضع، سادگی، مردانگی، زہد ووفاکیشی
محمدؐ کے مشن کا ترجمہ تھی تیری پالیسی

جس طرح حضرت کی زندگی باطنی علوم سے حد
درجہ آراستہ اور مزین تھی اسی طرح اللہ رب العزت
نے آپکو علم ظاہری سے بھی خوب ہی خوب نوازا تھا،
جہاں ایک طرف آپ نے اپنے فیوض باطنہ سے ایک
عالم کو سیراب کیا وہیں آپ نے اپنی پچاس سالہ
زندگی علوم ظاہرہ کے افادہ میں بھی گذاری ۱۹ رسال
کی عمر میں سنہ ۱۳۶۱ھ کے قریب آپ نے مدرسہ مظاہر علوم
میں داخلہ لیا جبکہ اس سے قبل آپ درگاہ پانی پت
کے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرچکے تھے،
دورانِ قیام مظاہر علوم آپ مدرسہ کے ہر دلعزیز ونہایت
ذہین، حد درجہ محنتی طلباء میں سے شمار کئے جاتے تھے،
آپ کے اساتذہ وشیوخ بھی آپکی بے حد قدر فرماتے تھے،

زمانۂ طالب علمی ہی سے آثار بزرگی نمایاں تھے۔

خود بیان فرماتے تھے کہ طالبعلمی کے زمانے میں بعد عشا مطالعہ کیا کرتا تھا، رات کا کچھ حصہ گذرنے پر ایک استاذ کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی انکی خدمت کرتا تا آنکہ وہ سوجاتے، پھر آکر مطالعہ کرتا رہتا یہانتک کی نیند آجاتی، سوجاتا — پھر تہجد میں سویرے اٹھنے کی کوشش کرتا، سب سے پہلے استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہوکر انھیں جگاتا، وضو کیلئے پانی رکھتا، پھر جب آپ نماز میں مشغول ہوجاتے تو خود اگر تہجد پڑھتا، بعد تہجد پھر مطالعہ شروع کرتا، نماز فجر تک جاری رکھتا، فجر بعد پھر مطالعہ میں مشغول ہوتا گھنٹی تک یہ سلسلہ جاری رکھتا، پھر اسباق میں شریک ہوتا، ناشتہ وغیرہ کی توکبھی نوبت ہی نہ آتی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے جب زمانۂ طالبعلمی ہی سے ایسا مجاہدہ اور ایسی محنت فرمائی تب کہیں جاکر آپ عارف باللہ ہوئے اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بنے کسی ایسے ہی آغاز کو سنکر شاعر نے یہ شعر کہا تھا ؎

تیرے انجام برتر کا پتہ آغاز دیتا تھا
تیرا مستقبلِ تاباں تجھے آواز دیتا تھا

آپ مظاہر علوم سے فارغ ہوکر جب آئے تو سب سے پہلے باندہ کے پاس واقع شہر فتحپور ہنسوہ کے قدیم مدرسہ "مدرسہ اسلامیہ فتحپور" سے تدریسی اور تعلیمی دور کا آغاز فرمایا، پھر کچھ دنوں بعد بعض حالات کی بنا پر اپنے وطن ہتھورا تشریف لے گئے اور وہیں اپنے مشہور زمانہ مدرسہ "مدرسہ ہتھورا" کی بنیاد ڈالی اور اسوقت سے وفات کے وقت تک مختلف اسباق اور مدرسہ کے نظم ونسق کا تعلق آپ ہی سے رہا آپکو سبق پڑھانے اور سمجھانے کا خاص ملکہ حاصل تھا، آپ چاہتے تھے کہ ہر ہر بات طالبعلم کے ذہن میں اتر جائے، طلبا ہی کی سہولت کی خاطر آپنے "تسہیل" کا نصاب مرتب فرمایا جسمیں تجوید، نحو، صرف، منطق سے متعلق کتابیں تصنیف فرمائیں۔

اور سہولت پسند طبائع کا لحاظ فرماتے ہوئے شرح جامی کی شرح "التسہیل السامی" جو محض حلِ نفسِ مضمون پر مشتمل ہے تالیف فرمائی اور سلم العلوم کی شرح "اسعاد الفہوم" مرتب فرمائی۔

آپ کو ہر ہر فن پر مکمل عبور حاصل تھا۔ آپ بیک وقت عمدہ قاری، مشہور عالم، بہترین محدث تھے حاصل یہ کہ آپ اس شعر کے بالکل صحیح مصداق تھے ؎

محقق، مجتہد، عالم، محدث، حافظ وقاری
باایں اوصاف شہرت سے بری اظہار سے عاری

حضرت اپنے پیچھے اوصاف وکمالات کا جو ذخیرہ چھوڑ کر گئے ہیں وہ ہمارے احاطۂ قلم سے باہر اور ہم جیسوں کی پہنچ سے دور .... بہت دور ہے، اس لئے ہم چند باتوں کیساتھ اپنے مضمون کی بساط کو لپیٹتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ اپنے اکابر کی یادگار اور

(باقی صـ ۶۲ پر)

نبیؐ کے عشق میں ڈوبا ہوا اللہ والا تھا

از: [illegible] تاج سلطان پوری
متعلم دارالعلوم دیوبند

سبھی احباب محوِ گفتگو تھے مطمئن ہو کر
اچانک اک صدا گونجی جو ٹکڑے کر گئی دل کو
زمانے تک مئے وحدت پلائی جس نے دنیا کو
وہ ساقی ہم نے جس سے بادہ نوشی کا ہنر سیکھا
جو اس دنیا میں رہ کر ساری دنیا سے نرالا تھا
خدا کے چاہنے والوں میں جس کا نام اونچا تھا
وہی صدیقؒ جو حق آشنا تھا نوجوانی سے
مجسم علم کہئے پیکرِ علم و عمل کہئے
کرم بے مثل تھا وہ شفقتوں کا اک خزینہ تھا
ملایا حق سے اہلِ حق کو حق سے آشنا بن کر
فرشتو! میرے ساقی کی بڑی تعظیم تم کرنا
نہ ہم سے قدر ہو پائی خدارا قدر تم کرنا
خدا شاہد غمِ صدیقؒ برسوں تک رلائے گا
خدایا صبر کی توفیق دے ہم رونے والوں کو
وہاں بھی میرے حضرت کو خدا اعلیٰ مقامی دے
عطا کر پیروی صدیقؒ کی ہم نیک بن جائیں
یقیناً حضرتِ صدیقؒ اب جنت مکانی ہے
خداوندا یہ تاجؔ ان کی غلامی کا شرف پائے

کوئی مشغول تھا پڑھنے میں اٹھا تھا کوئی سو کر
جو لمحوں میں مکدر کر گئی ہر ایک محفل کو
بصد اخلاص راہِ حق دکھائی جس نے دنیا کو
وہ غازی ہم نے جس سے سرفروشی کا ہنر سیکھا
نبی کے عشق میں ڈوبا ہوا اللہ والا تھا
کتابِ زندگی پڑھئے تو ہر اک کام اونچا تھا
بالآخر آج رخصت ہو گیا دنیائے فانی سے
تمام اوصاف میں یکتا سمجھئے بے بدل کہئے
ہزاروں خوبیاں تھیں جس میں وہ ایسا نگینہ تھا
مٹائے نقش ہر باطل کے اس نے حق نما بن کر
بہت خاطر سے پیش آنا بڑی تکریم تم کرنا
قدم میں شام ہو ان کے تو پہلو میں سحر کرنا
دلوں میں درد ہو گا جب کبھی وہ یاد آئے گا
عمل سے آشنا کر غفلتوں میں سونے والوں کو
عطا کر جنتِ اعلیٰ اور فرشتوں کی سلامی دے
پیامِ حضرتِ صدیقؒ ہے ہم ایک بن جائیں
ملا ہے ان کو حق کا قرب وہ خلد آشیانی ہے
انھیں کے نقشِ پا ڈھونڈے جہاں جائے جدھر جائے

مولانا عبدالوحید صاحب قاسمی
بارہ کماں، بجنور۔

نالۂ غم

بیادگار حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رح

شب سیاہ ہے کالی گھٹا کے سائے ہیں
اجل نے کتنے خطرناک پر بچھائے ہیں

چمن سے پھولوں کی بارات ہوگئی رخصت
بہار تیری ہر ایک بات ہوگئی رخصت

وطن کا حسن لٹا موسم بہار گیا
وہ کیا گیا کہ زمانے سے اعتبار گیا

یقین ہے کہ ہوا تو بہشتیوں کا رفیق
تمہارے واسطے کافی تھی نسبت صدیق

یہ کیا دیا تجھے باندہ کی سرزمیں ہم نے
خبر ہے کیسی امانت سپرد کی ہم نے

وہ ملک وقوم کا تابندہ اک ستارہ تھا
غریب وبیکس ومظلوم کا سہارا تھا

ہے اعتراف کہ وہ ایسا صاحب فن تھا
کہ جسکی ذات سے ہندوستان روشن تھا

جو دل کو موہ لے وہ حسن روئے زیبا تھا
ہمارے عہد کا کہتے ہیں اک مسیحا تھا

تری حیات عبارت تھی جہد پیہم سے
جہان علم درخشندہ تھا ترے دم سے

وہ سادہ ذات تری آبروئے گلشن تھی
ہر ایک رہرو درماندہ کا نشیمن تھی

غم محبت انسانیت پیام ترا
ہر ایک شخص کے کام آنا تھا ہی کام ترا

وہ ایک زاہد شب زندہ دار تھا نہ رہا
کلام پاک کا سرمایہ دار تھا نہ رہا

شفا کو ڈھونڈھنے اب کس کے در پہ جاؤ گے
پیاس دل کی وحید اب کہاں بجھاؤ گے

ایڈیٹر کے نام

ریاض الجنۃ کی ڈاک

(ادارہ)

مکرمی و محترمی جناب حضرت مولانا عبدالعظیم ندوی صاحب

دامت برکاتہم العالیہ

مدیر مسئول ماہنامہ " ریاض الجنۃ "

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سلام ورحمت مسنون عافیت بعدہ عرضیکہ!

راقم ایک عرصے سے آپکے " رسالہ ریاض الجنۃ " کا مطالعہ کررہا ہے۔ رسالہ بڑا پسند آتا ہے۔ اس کا بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے، کبھی کبھی کافی تاخیر ہو جاتی ہے، جسکی وجہ سے بڑی بے چینی رہتی ہے۔ رسالہ پڑھنے کے بعد دوست احباب کی مطالعہ کے لئے لائن لگی رہتی ہے۔ الحمدللہ آپکا رسالہ ہمارے دوست احباب میں کافی مقبول ہے۔ رسالہ کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رسالے کے ذریعے حضرت والا پیر و مرشد مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب مدظلہٗ کی خیر خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ جس سے دل کو کافی سکون ملتا ہے۔

پچھلے مارچ کے شمارے میں مولانا محمد ارشد صاحب اعظمی کا مضمون " سیدنا ابوبکر صدیق کی صداقت و شجاعت " کے عنوان سے نظر نواز ہوا۔ مضمون بڑا پسند آیا۔ درمیان مضمون انھوں نے ایک واقعہ " حبیب نجار " کا ذکر کیا ہے۔ جس کا ذکر " سورۂ یٰسین " میں ہے۔ ہم ادارہ کے ذریعے مولانا سے مؤدبانہ التماس کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان کے قصے سے آگاہ کریں۔ تاکہ ہم " لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ " پر عمل پیرا ہو سکیں۔ بقیہ احوال لائق شکر و اطمینان ہیں، آپ سے بھی دعاؤں کی درخواست ہے۔ امید ہے کہ دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ عاجز اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو شرف مقبولیت بخشے اور امتِ محمدیہ کے لئے اِسے رہبر اور ہادی بنائے۔ آمین ثم آمین۔

والسلام

میمن خلیل احمد سلیمان

جامع مسجد، بمبئی ۳

۰/۵/۹۰ء

مکرمی و محترمی جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون!

ماہنامہ ریاض الجنۃ شمارہ ستمبر ۱۹۹۰ء بصارت نواز ہوا۔ اداریہ " مسلمانوں کیلئے سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن ہر مرض کی دوا نہیں " حقیقت پر مبنی ہے اور نہایت مفید مشورہ ہے۔ مضمون دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں عام کوتاہی، اس کام میں مشغول نامشغول دونوں ہی کیلئے مشعلِ راہ ہے اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق د

چند ملفوظات وارشادات، دورِ حاضر کا ایک اہم مسئلہ، ہم اور ہماری تباہی، ذمہ دار کون؟ ہم خود، نہایت مفید اور معلوماتی اور تربیتی مضامین ہیں۔ ہاں مضمون، بادلِ ناخواستہ، پڑھ کر افسوس ہوا۔ دونوں جانبین کو احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔ تعجب ہے اشاعت میں کیسے آگئے۔ بادلِ ناخواستہ کے علاوہ تمام مضامین اچھے اور افادیت لئے ہوئے ہیں بار بار پڑھنے کی ترغیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اس رسالے کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور مفید عام وخاص بنائے۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت کاملہ وعافیت دارین سے نوازے۔ آمین

دعاؤں کی درخواست ہے۔ فقط والسلام

دعاؤں کا طالب

امین الدین خاں، متصل جامع مسجد

دیوریا۔ ۲۷۴۰۰۱ (یوپی)

المرقوم ۷؍ اکتوبر ۱۹۹۷ء

مولانا عبدالعظیم صاحب مدظلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج شریف؟ امابعد

ریاض الجنۃ مل رہا ہے اور ہم الحمدللہ استفید ہو رہے ہیں۔ یہی نہیں اب تو انشاء اللہ اسکے مضامین ہمارے ماہنامہ "الاسلام" برطانیہ کے قارئین کیلئے بھی شائع کریں گے۔

یوں تو ماشاء اللہ ہر ایک سے ایک بڑھ کر ہے لیکن مولوی ابوطلحہ بیگوسرائے سلمہ، کا مضمون "عرفانِ محبت"، بہت جامع اور مفید پایا۔ ایسے مضامین کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔ اہل اللہ کی صحبت کے بارے میں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ یہ فرض عین ہے اور صرف اسی میں ایمان کی سلامتی ہے اور بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس علیہ الرحمہ کی تبلیغی تحریک کی روح یہی ہے کہ عوام کو تجربہ کار علماء وصلحاء سے جوڑا جائے۔ بار بار فرمایا ہے کہ معلم کے پاس جاکر دین سیکھے اور مشائخ کے پاس جاکر تربیت کرائے، تبلیغ کا کام اس راہ کی تعلیم دیتا ہے۔ کم سے کم درجہ یہ ہے کہ مقامی علماء وصلحاء سے وابستہ ہو کر دین سیکھا جائے جماعتوں میں نکلنے کا مقصد صرف جذبہ واحساس پیدا کرنا ہے، شوق وذوق حاصل کرنا ہے پھر اہل اللہ سے وابستہ ہو کر دین سیکھے۔ والد مکرم دامت برکاتہم کو خصوصی دعا سلام عرض کریں اور ہمارے حق میں دعائے خیر کی التجا ہے۔

والسلام

بندہ ... ابراہیم یوسف باوا رنگونی

(برطانیہ) ۱۰؍ ۹۷ء

منبع محاسن اشفاق، ومخزن علوم وفنون وقابلِ صد احترام

جناب مولانا عبدالعظیم صاحب دامت برکاتہم

مؤدبانہ سلام قبول فرمایئے۔ بعد تسلیم بصد تعظیم وتکریم

عرض ہے کہ آپ کا ایمان افروز اور دل نشین ریاض الجنۃ ہر ماہ وقت پر دستیاب ہو رہا ہے۔ بڑی لگن اور دلچسپی کیساتھ مطالعہ کرتا ہوں اور پھر اور لوگوں کو بھی دے دیتا ہوں تاکہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ الحمدللہ ماہنامہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے امتیازی شان کا مالک ہے مالک حقیقی اپنا کام جس سے بھی لے لے یہ اسکی حکمت اور رحمت پر منحصر ہے۔ ادھر کئی سال سے ہمارے محترم و معظم مولانا عبدالعظیم صاحب سے جو اہم کام ایک وسیع پیمانے پر لے رہا ہے وہ اسکا ایک نمونہ ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔ دلی دعا ہے کہ حق تعالےٰ آپ جیسے بزرگ ہستی کے فیوض و برکات سے ملت و قوم کو فیضیاب کرے اور اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت لے کر دنیا و آخرت کی خوشگوار نعمتوں، لازوال سعادتوں سے مالا مال کرے اور آپکے حامیوں کے لئے ایسا انعام دونوں جہاں میں عطا فرمائے جس کو بیان کرنے سے زبان بھی عاجز رہے۔ آمین ثم آمین۔ والسلام

ارشاد احمد خاں، پنڈرہ
بنارس۔ ۲۸ ۹۶ء

مخدوم گرامی حضرت مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی
دامت معالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، بحمدہ ریاض الجنۃ پابندی سے دستیاب ہو رہا ہے ہم جیسے دور افتادوں کی حضرت والا دامت برکاتہم کی خیریت کا شدید انتظار رہا کرتا ہے رسالے سے حضرت والا کی خیریت معلوم کر کے سامان تسلی حاصل کرتے ہیں حضرت والا کے پاس ڈاک سے جو خطوط ارسال کرتے ہیں پابندی سے خیریت نہ پاکر حسرت اور اضطراب رہا کرتا ہے جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

ماشاء اللہ آپ کا اداریہ بہت خوب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مزید زور قلم کی دولت سے سرفراز فرمائیں، آمین

• بحمدہٖ مدرسے کے حالات قابل شکر ہیں، دعوات صالحہ میں یاد رکھنے کی گذارش ہے۔ اگر ممکن ہو اور مناسب خیال فرمائیں تو حضرت والا کی خدمت میں سلام مسنون اور دعا کی گذارش کر دیں۔ والسلام

محتاج دعا: علی احمد پلیادی پٹن، گجرات
۸ ۹۶ء

بخدمت حضرت مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاج گرامی مع کارکنان بخیریت ہو!

بعدہٗ عرض اینکہ ریاض الجنۃ کے اجراء کے سلسلہ میں خط ارسال کیا تھا آپنے شرف قبولیت سے نواز کر ماہ جولائی ۹۶ء سے ریاض الجنۃ کا اجرا فرمایا ہم خدام مدرسہ آپکے مشکور ہیں مضامین کو دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس ریاض الجنۃ کو پھلنے پھولنے کی توفیق عنایت فرمائے اور اسکے اور حضرت والا مدظلہ کے فیض کو تادیر قائم رکھے اور آخرت میں اندر ریاض الجنۃ میں جگہ عنایت فرمائے۔
والسلام

محتاج دعا: غلام سرور رہتاسی
مدرسہ عربیہ رفاہ العلوم بکرم گنج، رہتاس

احوال و کوائف

عبد العظیم ندوی

مدرسہ ریاض العلوم چوکیہ

گورینی، جونپور

الحمد للہ مدرسہ میں ہر طرح کی عافیت ہے حضرت والا دامت برکاتہم کی صحت بدستور سابق ہے۔ ضعف و پیرانہ سالی کیوجہ سے کہیں کے سفر کی ہمت نہیں ہوتی البتہ صبح ناشتہ کے بعد ڈاک لکھوانے اور بعد عصر مجلس و عمومی ملاقات کا معمول ہے، واردین و صادرین کا سلسلہ ہر وقت رہتا ہے قارئین دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ سایۂ عاطفت کو تا دیر قائم رکھے۔

جدید کتب خانے کا افتتاح! عربی مدارس و دینی اداروں کیلئے کتب خانہ کی حیثیت قلب و روح کی ہے، اس لئے کہ اہلِ مدرسہ کی عظمت فراہمی کتب اور اسکے مطالعہ ہی سے وابستہ ہے اور مستند کتابوں کا ذوق ہی اہل علم حضرات کا ہتھیار اور تسکین کا سامان ہے۔ اسکے پیش نظر ہر دور میں عربی مدارس نے فراہمی کتب پر پوری توجہ کی ہے۔

الحمد للہ ہمارے مدرسہ نے بھی روز اول سے اسکی جانب کمال اعتنا رکھا۔ حدیث تفسیر فقہ کے علاوہ تمام علوم و فنون کے مستند مصادر و مراجع فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ گذشتہ بیس برسوں کی جد و جہد سے کتابوں کا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا، کتابوں کی کثرت اور مسلسل اضافے کیوجہ سے قدیم کتب خانہ اپنی وسعتوں سمیت تنگ پڑ گیا تھا لہذا کتابوں کی حفاظت کی خاطر تین سال قبل جدید کتب خانہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا جسکی تعمیر بتدریج جاری تھی، بفضلہ تعالیٰ اب اسکی دو منزلہ عالیشان عمارت تیار ہو گئی قدیم کتب خانہ سے کتابیں و الماریاں منتقل کر کے جدید میں نصب کیجا چکی ہیں، نگراں کتب خانہ مولانا مقبول احمد صاحب مظاہری کی خداداد صلاحیت و حسن سلیقہ کی بنا پر تزئین و ترتیب جدید کے بعد کتب خانے کا حسن دو بالا ہو گیا ہے۔

۹ رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۹۶ء کی صبح پہلی گھنٹی میں طلباء، اساتذہ و ملازمین کی موجودگی میں حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب دامت برکاتہم کی دعا سے کتب خانہ جدید کا افتتاح کر دیا گیا ہے۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

جدید دار الاقامہ کی تعمیر! احاطہ دار الحدیث میں شمالی بڑے دار الاقامہ کی دوسری منزل کی تعمیر شروع کردی گئی ہے۔ ابتدائی قسط میں پانچ کمروں کی مکمل تعمیر کا ٹھیکہ دیدیا گیا ہے کتب خانہ کے افتتاح سے ایک ہفتہ قبل اس جدید دار الاقامہ کی ابتدائی تعمیر بھی حضرت والا دامت برکاتہم کے دست مبارک و دعاء سے کرادی گئی ہے واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

وفیات

(۱) دفتر محاسبی کے معتمد ریاض الحق صاحب کی اہلیہ کا ۱۵؍ رجب ۱۴۱۶ھ ۱۶؍ نومبر ۱۹۹۶ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ اسرہٹہ ضلع جونپور کی معروف شخصیت حاجی محمد اسحاق و ماسٹر محمد مزمل مرحومین کی بہن اور راقم کے چھوٹے بہنوئی مولانا حافظ عبد الماجد صاحب کی والدہ محترمہ تھیں، گذشتہ چند برسوں سے علیل چل رہی تھیں، چند ماہ سے تو بالکل صاحب فراش تھیں وفات سے ایک ہفتہ قبل ہی آواز بند ہوگئی تھی دماغ کی جھلی میں ورم اور پانی اتر گیا تھا۔ اعظم گڈھ میں اپنے نواسے ڈاکٹر عبد اللہ صاحب وانکی اہلیہ ڈاکٹر زرین صاحبہ کے مرجع خلائق "اسحاق ہاسپیٹل" میں زیر علاج رہیں یہ دونوں معالج رہے اور تیمار دار بھی، اللہ تعالیٰ ہر دو ڈاکٹر صاحبان کی عمر میں برکت عطا فرمائے ان کے ہاتھوں مریضوں کو شفا نصیب فرمائے۔ وفات سے ایک روز قبل دماغ کے ایکسرے وچیک اپ کیلئے مرحومہ کو بنارس لیجایا گیا جہاں اگلے روز وفات ہوگئی نعش اعظم گڈھ لائی گئی اہل علم و عمائدین شہر کے بڑے مجمع کیساتھ، جامعۃ الرشاد" کے صحن میں نماز جنازہ کے بعد مدرسہ سے متصل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ قارئین سے دعاء مغفرت وایصال ثواب کی گذارش ہے۔

(۲) دین محمد عُرف دینو

۱۳؍ رجب ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۵؍ نومبر ۱۹۹۵ء کو وفات پاگئے۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ۔

جونپور کے شمال مشرق میں واقع خلیل پور بھروٹہ کے قریب ہندوؤں کی چھوٹی سی آبادی کا باشندہ تھا باپ کا اکیلا تھا اور باپ بھی حقیقی نہیں سوتیلا اور مریض تھا باپ نے آبادی کے قدیمی رسم کے مطابق بچپن ہی میں دینو کا نکاح کردیا تھا۔ وہ بھی غیر کفو اور بڑی عمر والی عورت سے لہذا جلد ہی تفریق ہوگئی اور باپ بھی مرگیا پھر دینو مانی کلاں (ضلع جونپور) چلا آیا تجرد کی زندگی گذارنے کا عہد کرلیا لہذا آبادی سے میلوں دور برنگی و موئیں کی افتادہ زمین کے کسی گوشہ میں جھونپڑی ڈال کر پڑا رہتا تھا چند مرغیاں وبطخ پالنے اور چند پودے سبزی اگانے کو ذریعہ معاش بنایا لہذا مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں میں آمدورفت رکھی ایک زمانے تک مدرسہ کی بیجی وصول کی،

اساتذہ طلبار و ملازمین سے تعلق کی وجہ سے ایسے سیدھے بغدادی قاعدہ سپارہ پڑھ لیا۔ جب ۱۹۷۳ء میں حضرت والا مدظلہ نے یہاں (گورینی) میں مدرسہ شروع کیا تو دیو بھی اپنی کٹیا (جھونپڑی) کو خیر آباد کہکر یہاں آگئے اور مدرسہ سے متصل بھیٹے پر اپنے ہاتھ سے جھونپڑی بنالی۔

اس کے سب سے قریبی دوست سعید احمد عرف عیدو تھے جس کا انتقال ٹھیک ایک سال قبل ۱۶ / نومبر ۱۹۹۶ء شنبہ کی شب میں ہو چکا ہے دونوں بالکل ناخواندہ تھے لیکن حضرت والا اور مدرسہ سے بے پناہ تعلق اور عقیدت رکھتے تھے بدون اجرت و ملازمت مدرسہ کے ہر کام کیلئے مستعد رہتے۔ دیہات سے غلہ فراہمی ہو یا چکی وصولیابی لکڑیاں لانا ہو یا پھوس پوال وغیرہ مطبخ کا کام ہو یا جاروب کشی کا، دونوں پوری محنت ولگن سے لگے رہتے۔ اپنی عمر طبعی اور بڑھاپے کو پہونچکر دونوں ایک سال کے فصل سے زیر زمیں پہونچ گئے۔ اللہ تعالیٰ دونوں کیساتھ خصوصی رحم وکرم کا معاملہ فرمائے مدرسہ سے تعلق اور اہل علم سے محبت کے صلہ میں مغفرت تامہ سے نوازکر جنت نصیب فرمائے۔

---

(۳) حاجی خیر اللہ مرحوم

لونیہ ڈیہہ، اعظم گڈھ

۸ / رجب ۱۴۱۸ھ مطابق ۹ / نومبر ۱۹۹۷ء یکشنبہ کو ۱۱ / بجے دن میں اچانک وفات پاگئے، کل شئی ہالک إلا وجہہ (القرآن)

حاجی صاحب مرحوم ہم سب کے دوست مولانا ابوالخیر صاحب قاسمی نائب ناظم جامعہ شرقیہ لونیہ ڈیہہ کے والد محترم تھے، مرحوم بڑے مخیر و ہمدرد انسان تھے نماز کے پابند تو ایسے کہ تقریباً پچاس سال سے فجر کی اذان خود پکارتے تھے وفات کے روز بھی معمول کے مطابق فجر کی اذان دی جماعت کے ساتھ نماز ادا کی، معمولات پورے کئے پھر گھر کے مختلف کام کاج بھی کئے ۹ / بجے صبح کے قریب گھر کے صحن میں اچانک گر گئے، خاندانی عزیز ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے فوراً انجکشن وغیرہ دیا جس سے سکون ہوا لیکن دو گھنٹہ کے بعد وفات پاگئے وقتی چیک اپ سے اندازہ ہوا کہ بلڈ پریشر ہائی ہے اور دل کا دورہ بھی پڑا ہے، دوا علاج معالجہ جاری تھا کہ دو گھنٹہ بعد گھر ہی پر وفات ہوگئی۔

قارئین سے دعاء مغفرت وایصال ثواب کی درخواست ہے۔

(صـ ۸۶ کا بقیہ)

مرحوم کی زندگی کی ہر ادا ہر خاص وعام کے لئے مشعل راہ ہے۔ ایسے باکمال لوگ مرتے نہیں ہیں بلکہ اپنے کارناموں، باقیات صالحات وفیض رسانی کے ذریعہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

شعر: آپ کے افکار سے روشن رہے گی کائنات
حشر تک لیتی رہے گی نام تاریخ حیات

سچ ہے عاشق ذات حق کبھی مرتا نہیں ہے۔

شعر: ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام